بانگ درا

اقبال

1924

(جملہ حقوق مع حق ترجمہ محفوظ)

فہرست

شمار	نظم	صفحہ	شمار	نظم	صفحہ
	حصّۂ اوّل (... ۱۹۰۵ء تک)		۱۷	آفتاب (ترجمہ گایتری)	۳۰
۱	ہمالہ	۳	۱۸	شمع	۳۲
۲	گلِ رنگیں	۶	۱۹	ایک آرزو	۳۵
۳	عہدِ طفلی	۸	۲۰	آفتابِ صبح	۳۷
۴	مرزا غالب	۹	۲۱	دردِ عشق	۳۹
۵	ابرِ کوہسار	۱۱	۲۲	گلِ پژمردہ	۴۱
۶	ایک مکڑا اور مکھی	۱۲	۲۳	سیّد کی لوحِ تربت	۴۲
۷	ایک پہاڑ اور گلہری	۱۵	۲۴	ماہِ نو	۴۴
۸	ایک گائے اور بکری	۱۶	۲۵	انسان اور بزمِ قدرت	۴۵
۹	بچے کی دعا	۱۹	۲۶	پیامِ صبح	۴۷
۱۰	ہمدردی	۲۰	۲۷	عشق اور موت	۴۸
۱۱	ماں کا خواب	۲۱	۲۸	زہد اور رندی	۵۰
۱۲	پرندے کی فریاد	۲۳	۲۹	شاعر	۵۳
۱۳	خفتگانِ خاک سے استفسار	۲۴	۳۰	دل	۵۴
۱۴	شمع و پروانہ	۲۷	۳۱	موجِ دریا	۵۵
۱۵	عقل و دل	۲۸	۳۲	رخصت اے بزمِ جہاں!	۵۶
۱۶	صدائے درد	۲۹	۳۳	طفلِ شیرخوار	۶۰

شمار	نظم	صفحہ
۳۴	تصویرِ درد	۶۲
۳۵	نالۂ فراق	۷۴
۳۶	چاند	۷۶
۳۷	بلالؓ	۷۸
۳۸	سرگذشتِ آدم	۸۰
۳۹	ترانۂ ہندی	۸۲
۴۰	جگنو	۸۳
۴۱	صبح کا ستارہ	۸۵
۴۲	ہندوستانی بچوں کا قومی گیت	۸۷
۴۳	نیا شوالہ	۸۸
۴۴	داغ	۸۹
۴۵	ابر	۹۲
۴۶	ایک پرندہ اور جگنو	۹۳
۴۷	بچہ اور شمع	۹۴
۴۸	کنارِ راوی	۹۶
۴۹	التجائے مسافر	۹۷
۵۰	غزلیات	۱۰۰ تا ۱۱۲
	حصۂ دوم ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک	
۵۱	محبت	۱۱۵
۵۲	حقیقتِ حسن	۱۱۶

شمار	نظم	صفحہ
۵۳	پیام	۱۱۷
۵۴	سوامی رام تیرتھ	۱۱۸
۵۵	طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام	۱۱۹
۵۶	اخترِ صبح	۱۲۰
۵۷	حسن و عشق	۱۲۱
۵۸	۔۔۔۔ کی گود میں بلی دیکھ کر	۱۲۲
۵۹	کلی	۱۲۳
۶۰	چاند اور تارے	۱۲۴
۶۱	وصال	۱۲۶
۶۲	سلیمیٰ	۱۲۷
۶۳	عاشقِ ہرجائی	۱۲۸
۶۴	کوششِ ناتمام	۱۳۱
۶۵	نوائے غم	۱۳۲
۶۶	عشرتِ امروز	۱۳۳
۶۷	انسان	۱۳۴
۶۸	جلوۂ حسن	۱۳۵
۶۹	ایک شام	۱۳۶
۷۰	تنہائی	۱۳۷
۷۱	پیامِ عشق	″
۷۲	فراق	۱۳۹

ج

شمار	نظم	صفحہ
۷۳	عبدالقادر کے نام	۱۴۰
۷۴	صقلیہ	۱۴۱
۷۵	غزلیات	۱۴۳ تا ۱۵۴
	حصہ سوم (۱۹۰۸ء سے ....)	
۷۶	بلادِ اسلامیہ	۱۵۵
۷۷	ستارہ	۱۵۸
۷۸	دو ستارے	۱۵۹
۷۹	گورستانِ شاہی	۱۶۰
۸۰	نمودِ صبح	۱۶۶
۸۱	تضمین بر شعر انیسی شاملو	۱۶۷
۸۲	فلسفۂ غم	۱۶۸
۸۳	پھول کا تحفہ عطا ہونے پر	۱۷۱
۸۴	ترانۂ ملی	۱۷۲
۸۵	وطنیت	۱۷۳
۸۶	ایک حاجی مدینے کے راستے میں	۱۷۵
۸۷	قطعہ	۱۷۶
۸۸	شکوہ	۱۷۷
۸۹	چاند	۱۸۷
۹۰	رات اور شاعر	۱۸۸
۹۱	بزمِ انجم	۱۹۰
۹۲	سیرِ فلک	۱۹۲
۹۳	نصیحت	۱۹۴
۹۴	رام	۱۹۵
۹۵	موٹر	۱۹۶
۹۶	انسان	۱۹۷
۹۷	خطاب بہ جوانانِ اسلام	۱۹۸
۹۸	غرۂ شوال یا ہلالِ عید	۱۹۹
۹۹	شمع اور شاعر	۲۰۱
۱۰۰	مسلم	۲۱۶
۱۰۱	حضور رسالت مآبؐ میں	۲۱۸
۱۰۲	شفاخانۂ حجاز	۲۱۹
۱۰۳	جوابِ شکوہ	۲۲۰
۱۰۴	ساقی	۲۳۲
۱۰۵	تعلیم اور اس کے نتائج	"
۱۰۶	قربِ سلطان	۲۳۴
۱۰۷	شاعر	۲۳۵
۱۰۸	نویدِ صبح	۲۳۶
۱۰۹	دعا	۲۳۷
۱۱۰	عید پر شعر لکھنے کی فرمائش کے جواب میں	۲۳۸
۱۱۱	فاطمہ بنت عبداللہ	۲۳۹

شمار	نظم	صفحہ	شمار	نظم	صفحہ
۱۱۲	شبنم اور ستارے	۲۴۰	۱۳۰	پھولوں کی شہزادی	۲۷۴
۱۱۳	محاصرۂ ادرنہ	۲۴۲	۱۳۱	تضمین بر شعر صائب	۲۷۵
۱۱۴	غلام قادر رہیلہ	۲۴۳	۱۳۲	فردوس میں ایک مکالمہ	۲۷۶
۱۱۵	ایک مکالمہ	۲۴۵	۱۳۳	مذہب	۲۷۷
۱۱۶	میں اور تو	۲۴۶	۱۳۴	جنگِ یرموک کا ایک واقعہ	۲۷۸
۱۱۷	تضمین بر شعر ابو طالب کلیم	۲۴۷	۱۳۵	مذہب	۲۷۹
۱۱۸	شبلی و حالی	۲۴۸	۱۳۶	پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ	۲۸۰
۱۱۹	ارتقا	۲۴۹	۱۳۷	شبِ معراج	۲۸۱
۱۲۰	صدیق رض	۲۵۰	۱۳۸	پھول	[illegible]
۱۲۱	تہذیبِ حاضر	۲۵۱	۱۳۹	شیکسپیئر	۲۸۳
۱۲۲	والدہ مرحومہ کی یاد میں	۲۵۲	۱۴۰	میں اور تو	۲۸۴
۱۲۳	شعاعِ آفتاب	۲۶۷	۱۴۱	اسیری	۲۸۶
۱۲۴	عرفی	۲۶۸	۱۴۲	دریوزۂ خلافت	〃
۱۲۵	ایک خط کے جواب میں	۲۶۹	۱۴۳	ہمایوں	۲۸۷
۱۲۶	نانک	۲۷۰	۱۴۴	خضرِ راہ	۲۸۸
۱۲۷	کفر و اسلام	۲۷۱	۱۴۵	طلوعِ اسلام	۳۰۳
۱۲۸	بلال رض	۲۷۲	۱۴۶	غزلیات	۳۰۴ تا ۳۴۲
۱۲۹	مسلمان اور تعلیمِ جدید	۲۷۳	۱۴۷	ظریفانہ	۳۴۳ تا ۳۴۸

دیباچہ

از شیخ عبدالقادر بیرسٹرایٹ لا سابق مدیر مخزن

کسے خبر تھی کہ غالب مرحوم کے بعد ہندوستان میں پھر کوئی ایسا شخص پیدا ہو گا۔ جو اردو شاعری کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دے گا اور جس کی بدولت غالب کا بینظیر تخیل اور نرالا اندازِ بیان پھر وجود میں آئیں گے اور ادب اردو کے فروغ کا باعث ہونگے مگر زبانِ اردو کی خوش اقبالی دیکھئے کہ اس زمانے میں اقبال سا شاعر اسے نصیب ہوا۔ جس کے کلام کا سکہ ہندوستان بھر کی اردو داں دنیا کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے اور جس کی شہرت روم وایران بلکہ فرنگستان تک پہنچ گئی ہے۔

غالب اور اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسداللہ خان غالب کو اردو اور فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا۔ اس نے اُن کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسدِ خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے۔ اور اس نے پنجاب کے ایک گوشہ میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔

جب شیخ محمد اقبال کے والد بزرگوار اور ان کی پیاری ماں اُن کا نام تجویز کر رہے ہونگے تو قبولِ دعا کا وقت ہوگا کہ اُن کا دیا ہوا نام اپنے پورے معنوں میں صحیح ثابت ہوا۔ اور ان کا اقبالمند بیٹا ہندوستان میں تحصیلِ علم سے فارغ ہو کر انگلستان پہنچا۔ وہاں کیمبرج میں کامیابی سے وقت ختم کر کے جرمنی گیا اور علمی دنیا کے اعلےٰ مدارج طے کر کے واپس آیا۔ شیخ محمد اقبال نے یورپ کے قیام کے زمانہ میں بہت سی فارسی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اور اس مطالعہ کا خلاصہ ایک محققانہ کتاب کی صورت میں شائع کیا۔ جسے فلسفۂ ایران کی مختصر تاریخ کہنا چاہیئے۔ اسی کتاب کو دیکھ کر جرمنی والوں نے شیخ محمد اقبال کو ڈاکٹر کا علمی درجہ دیا۔ سرکار انگریزی کو جس کے پاس مشرقی زبانوں اور علوم کی نسبت براہ راست اطلاع کے ذرائع کافی نہیں۔ جب ایک عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی شاعری نے عالمگیر شہرت پیدا کر لی ہے۔ تو اس نے بھی از راہِ قدر دانی سر کا ممتاز خطاب انہیں عطا کیا۔ اب وہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے نام سے مشہور ہیں۔ لیکن ان کا نام جس میں یہ لطف خداداد ہے کہ نام کا نام ہے اور تخلص کا تخلص اُن کی ڈاکٹری اور سری سے زیادہ مشہور اور مقبول ہے۔

سیالکوٹ میں ایک کالج ہے جس میں علمائے سلف کی یادگار اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے ایک بزرگ مولوی سید میر حسن صاحب علوم مشرقی کا درس دیتے ہیں حال میں انہیں گورنمنٹ سے خطابِ شمس العلما بھی ملا ہے۔ ان کی تعلیم کا یہ خاصہ ہے کہ جو کوئی ان سے فارسی یا عربی سیکھے۔ اس کی طبیعت میں اس زبان کا صحیح مذاق پیدا کر دیتے ہیں۔ اقبال کو بھی اپنی ابتدائے عمر میں مولوی سید میر حسن سا استاد ملا۔ طبیعت میں علم ادب سے مناسبت قدرتی طور پر موجود تھی۔ فارسی اور عربی کی تحصیل مولوی صاحب موصوف سے کی۔ سونے پر سہاگہ ہو گیا۔ ابھی اسکول میں ہی پڑھتے تھے کہ کلامِ موزوں زبان سے نکلنے لگا۔ پنجاب میں اردو کا

رواج اس قدر ہو گیا تھا۔ کہ ہر شہر میں زباندانی اور شعر و شاعری کا چرچا کم و بیش موجود تھا۔ سیالکوٹ میں بھی شیخ محمد اقبال کی طالب علمی کے دنوں میں ایک چھوٹا سا مشاعرہ ہوتا تھا اس کے لئے اقبال نے کبھی کبھی غزل لکھنی شروع کر دی۔ شعرائے اردو میں اُن دنوں نواب مرزا خان صاحب داغ دہلوی کا بہت شہرہ تھا۔ اور نظام دکن کے استاد ہونے سے انکی شہرت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ لوگ جو اُن کے پاس جا نہیں سکتے تھے۔ خط و کتابت کے ذریعہ دور ہی سے ان سے شاگردی کی نسبت پیدا کرتے تھے۔ غزلیں ڈاک میں اُن کے پاس جاتی تھیں اور وہ اصلاح کے بعد واپس بھیجتے تھے۔ پچھلے زمانہ میں جب ڈاک کا یہ انتظام نہ تھا کسی شاعر کو اتنے شاگرد کیسے میسر آ سکتے تھے۔ اب اس سہولت کی وجہ سے یہ حال تھا کہ سینکڑوں آدمی اُن سے غائبانہ تلمذ رکھتے تھے اور انہیں اس کام کے لئے ایک عملہ اور محکمہ رکھنا پڑتا تھا۔ شیخ محمد اقبال نے بھی انہیں خط لکھا اور چند غزلیں اصلاح کے لئے بھیجیں۔ اسطرح اقبال کو اردو زباندانی کے لئے بھی ایسے استاد سے نسبت پیدا ہوئی جو اپنے وقت میں زبان کی خوبی کے لحاظ سے فنِ غزل میں یکتا سمجھا جاتا تھا۔ گو اُس ابتدائی غزل گوئی میں وہ باتیں تو موجود نہ تھیں جن سے بعد ازاں کلامِ اقبال نے شہرت پائی۔ مگر جناب داغ پہچان گئے کہ پنجاب کے ایک دور افتادہ ضلع کا یہ طالب علم کوئی معمولی غزل گو نہیں۔ انہوں نے جلد کہدیا کہ کلام میں اصلاح کی گنجایش بہت کم ہے۔ اور یہ سلسلہ تلمذ کا بہت دیر قائم نہیں رہا۔ البتہ اس کی یاد دونو طرف رہ گئی۔ داغ کا نام اردو شاعری میں ایسا پایہ رکھتا ہے۔ کہ اقبال کے دل میں داغ سے اس مختصر اور غائبانہ تعلق کی بھی قدر ہے اور اقبال نے داغ کی زندگی ہی میں قبولِ عام کا وہ درجہ حاصل کر لیا تھا کہ داغ مرحوم اس بات پر فخر کرتے تھے کہ اقبال بھی ان لوگوں میں شامل ہے۔ جن کے کلام کی انہوں نے اصلاح کی۔ مجھے خود دکن میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا

اور میں نے خود ایسے فخریہ کلمات ان کی زبان سے سُنے۔

سیالکوٹ کے کالج میں ایف-اے کے درجہ تک تعلیم تھی۔ بی-اے کے لئے شیخ محمد اقبال کو لاہور آنا پڑا۔ انہیں علم فلسفہ کی تحصیل کا شوق تھا اور انہیں لاہور کے اساتذہ میں ایک نہایت شفیق استاد ملا۔ جس نے فلسفہ کے ساتھ ان کی مناسبت دیکھ کر انہیں خاص توجہ سے پڑھانا شروع کیا۔ پروفیسر آرنلڈ صاحب جو اب سر ٹامس آرنلڈ ہو گئے ہیں اور انگلستان میں مقیم ہیں غیر معمولی قابلیت کے شخص ہیں۔ قوتِ تحریر ان کی بہت اچھی ہے۔ اور وہ علمی جستجو اور تلاش کے طریقِ جدید سے خوب واقف ہیں۔ انہوں نے چاہا کہ اپنے شاگرد کو اپنے مذاق اور اپنے طرزِ عمل سے حصہ دیں اور وہ اس ارادہ میں بہت کچھ کامیاب ہوئے۔ پہلے انہوں نے علیگڈھ کالج کی پروفیسری کے زمانہ میں اپنے دوست مولٰنا شبلی مرحوم کے مذاق علمی کے پختہ کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اب انہیں یہاں ایک اور جوہرِ قابل نظر آیا۔ جس کے چمکانے کی آرزو اُن کے دل میں پیدا ہوئی۔ اور جو دوستی اور محبت استاد اور شاگرد میں پہلے دن سے پیدا ہوئی وہ آخرش شاگرد کو استاد کے پیچھے پیچھے انگلستان لے گئی۔ اور وہاں یہ رشتہ اور بھی مضبوط ہو گیا اور آج تک قائم ہے۔ آرنلڈ خوش ہے کہ میری محنت ٹھکانے لگی اور میرا شاگرد علمی دنیا میں میرے لئے بھی باعثِ شہرت افزائی ہوا۔ اور اقبال معترف ہے۔ کہ جس مذاق کی بنیاد سید میر حسن نے ڈالی تھی اور جسے درمیان میں داغ کے غائبانہ تعارف نے بڑھایا تھا۔ اس کے آخری مرحلے آرنلڈ کی شفیقانہ رہبری سے طے ہوئے۔

اقبال کو اپنی علمی منازل طے کرنے میں اچھے اچھے رہبر ملے۔ اور بڑے بڑے علما سے سابقہ پڑا۔ اُن لوگوں میں کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر میک ٹیگرٹ۔ براؤن۔ نکلسن اور سارلی قابلِ ذکر ہیں۔ پروفیسر نکلسن تو ہمارے شکریہ کے خاص طور پر مستحق ہیں کیونکہ انہوں نے اقبال کی مشہور فارسی نظم

"اسرارِ خودی" کا انگریزی ترجمہ کر کے اور اس پر دیباچہ اور حواشی لکھ کر یورپ اور امریکہ کو اقبال سے روشناس کیا۔ اسی طرح ہندوستان کی علمی دنیا میں جتنے نامور اس زمانہ میں موجود تھے مثلاً مولنا شبلی مرحوم۔ مولنا حالی مرحوم۔ اکبر مرحوم۔ سب سے اقبال کی ملاقات اور خط و کتابت رہی۔ اور ان کے اثرات اقبال کے کلام پر اور اقبال کا اثر ان کی طبائع پر پڑتا رہا۔ مولنا شبلی نے بہت سے خطوط میں اور حضرتِ اکبر نے نہ صرف خطوں میں بلکہ بہت سے اشعار میں اقبال کے کمال کا اعتراف کیا ہے۔ اور اقبال نے اپنی نظم میں ان باکمالوں کی جا بجا تعریف کی ہے۔

ابتدائی مشق کے دنوں کو چھوڑ کر اقبال کا اردو کلام بیسویں صدی کے آغاز سے کچھ پہلے شروع ہوتا ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء سے غالباً دو تین سال پہلے میں نے انہیں پہلی مرتبہ لاہور کے ایک مشاعرہ میں دیکھا۔ اس بزم میں ان کو ان کے چند ہم جماعت کھینچ کر لے آئے۔ اور انہوں نے کہہ سن کر ایک غزل بھی ان سے پڑھوائی۔ اُس وقت تک لاہور میں لوگ اقبال سے واقف نہ تھے۔ چھوٹی سی غزل تھی۔ سادہ سے الفاظ۔ زمین بھی مشکل نہ تھی۔ مگر کلام میں شوخی اور بیساختہ پن موجود تھا۔ بہت پسند کی گئی۔ اس کے بعد دو تین مرتبہ پھر اسی مشاعرہ میں انہوں نے غزلیں پڑھیں اور لوگوں کو معلوم ہوا۔ کہ ایک ہونہار شاعر میدان میں آیا ہے مگر یہ شہرت پہلے پہلے لاہور کے کالجوں کے طلبہ اور بعض اور ایسے لوگوں تک محدود رہی۔ جو تعلیمی مشاغل سے تعلق رکھتے تھے۔ اتنے میں ایک ادبی مجلس قایم ہوئی۔ جس میں مشاہیر شریک ہونے لگے اور نظم و نثر کے مضامین کی اس میں مانگ ہوئی۔ شیخ محمد اقبال نے اس کے ایک جلسہ میں اپنی وہ نظم جس میں "کوہ ہمالہ" سے خطاب ہے پڑھ کر سنائی۔ اس میں انگریزی خیالات تھے اور فارسی بندشیں۔ اس پر خوبی یہ کہ وطن پرستی کی چاشنی اس میں موجود تھی۔ مذاقِ زمانہ اور

ضروریاتِ وقت کے موافق ہونے کے سبب بہت مقبول ہوئی اور کئی طرف سے فرمائشیں ہونے لگیں کہ اسے شائع کیا جائے۔ مگر شیخ صاحب یہ عذر کر کے کہ ابھی نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ اسے اپنے ساتھ لے گئے اور وہ اس وقت چھپنے نہ پائی۔ اس بات کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ میں نے ادبِ اردو کی ترقی کے لئے رسالۂ مخزن جاری کرنے کا ارادہ کیا اس اثنا میں شیخ محمد اقبال سے میری دوستانہ ملاقات پیدا ہو چکی تھی۔ میں نے ان سے وعدہ لیا کہ اس رسالہ کے حصۂ نظم کے لئے وہ نئے رنگ کی نظمیں مجھے دیا کریں گے۔ پہلا رسالہ شایع ہونے کو تھا کہ میں ان کے پاس گیا اور میں نے ان سے کوئی نظم مانگی۔ انہوں نے کہا ابھی کوئی نظم تیار نہیں۔ میں نے کہا "ہمالہ" والی نظم دیدیجے۔ اور دوسرے مہینے کے لئے کوئی اور لکھئے۔ انھوں نے اُس نظم کے دینے میں پس و پیش کی۔ کیونکہ انہیں یہی خیال تھا کہ اسمیں کچھ خامیاں ہیں۔ مگر میں دیکھ چکا تھا کہ وہ بہت مقبول ہوئی۔ اس لئے میں نے زبردستی وہ نظم ان سے لے لی۔ اور مخزن کی پہلی جلد کے پہلے نمبر میں جو اپریل ۱۹۰۱ء میں نکلا شایع کر دی یہاں سے گویا اقبال کی اردو شاعری کا پبلک طور پر آغاز ہوا۔ اور ۱۹۰۵ء تک جب وہ ولایت گئے۔ یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس عرصہ میں وہ عموماً مخزن کے ہر نمبر کے لئے کوئی نہ کوئی نظم لکھتے تھے۔ اور جوں جوں لوگوں کو ان کی شاعری کا حال معلوم ہوتا گیا جا بجا مختلف رسالوں اور اخباروں سے فرمایشیں آنے لگیں۔ اور انجمنیں اور مجالس درخواستیں کرنے لگیں کہ انکے سالانہ جلسوں میں لوگوں کو وہ اپنے کلام سے محظوظ کریں۔ شیخ صاحب اس وقت طالب علمی سے فارغ ہو کر گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ہو گئے تھے اور دن رات علمی صحبتوں اور مشاغل میں بسر کرتے تھے۔ طبیعت زوروں پر تھی۔ شعر کہنے کی طرف جس وقت مائل ہوتے تو غضب کی آمد ہوتی تھی ایک ایک نشست میں بیشمار شعر ہو جاتے تھے۔ ان کے دوست اور بعض طالب علم

طرزِ ترنم سے بھی خاصے واقف ہیں۔ ایسا سماں بندھا کہ سکوت کا عالم چھا گیا اور لوگ جھومنے لگے۔ اس کے دو نتیجے ہوئے۔ ایک تو یہ کہ اب اُن کے لئے تحت اللفظ پڑھنا مشکل ہو گیا ہے۔ جب کبھی پڑھیں لوگ اصرار کرتے ہیں کہ لَے سے پڑھا جائے۔ اور دوسرا یہ کہ پہلے تو خواص ہی ان کے کلام کے قدردان تھے اور اس کو سمجھ سکتے تھے۔ اس کشش کے سبب عوام بھی کھنچ آئے۔ لاہور میں جلسۂ حمایت اسلام میں جب اقبال کی نظم پڑھی جاتی ہے تو دس دس ہزار آدمی ایک وقت میں جمع ہوتے ہیں اور جب تک نظم پڑھی جائے لوگ دم بخود بیٹھے رہتے ہیں۔ جو سمجھتے ہیں وہ بھی محو اور جو نہیں سمجھتے وہ بھی محو ہوتے ہیں۔

سنہ ۱۹۰۵ء سے سنہ ۱۹۰۸ء تک اقبال کی شاعری کا ایک دوسرا دور شروع ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے جو انہوں نے یورپ میں بسر کیا۔ گو وہاں انہیں شاعری کے لئے نسبتاً کم وقت ملا اور ان نظموں کی تعداد جو وہاں کے قیام میں لکھی گئیں تھوڑی ہے۔ مگر اُن میں ایک خاص رنگ وہاں کے مشاہدات کا نظر آتا ہے۔ اس زمانہ میں دو بڑے تغیر ان کے خیالات میں آئے ان تین سالوں میں سے دو سال ایسے تھے۔ جن میں میرا بھی وہیں قیام تھا اور اکثر ملاقات کے موقعے ملتے رہتے تھے۔ ایک دن شیخ محمد اقبال نے مجھ سے کہا کہ اُن کا ارادہ مصمم ہو گیا ہے کہ وہ شاعری کو ترک کر دیں۔ اور قسم کھا لیں کہ شعر نہیں کہیں گے اور جو وقت شاعری میں صرف ہوتا ہے۔ اسے کسی اور مفید کام میں صرف کریں گے۔ میں نے اُن سے کہا کہ ان کی شاعری ایسی شاعری نہیں ہے جسے ترک کرنا چاہیئے۔ بلکہ اُن کے کلام میں وہ تاثیر ہے جس سے ممکن ہے کہ ہماری درماندہ قوم اور ہمارے کم نصیب ملک کے امراض کا علاج ہو سکے اس لئے ایسی مفید خداداد طاقت کو بیکار کرنا درست نہ ہو گا۔ شیخ صاحب کچھ قائل ہوئے کچھ نہ ہوئے اور یہ قرار پایا کہ آرنلڈ صاحب کی رائے پر آخری فیصلہ چھوڑا جائے۔ اگر وہ مجھ سے

جو پاس ہوتے۔ پنسل کاغذ لیکر لکھتے جاتے۔ اور وہ اپنی دھن میں کہتے جاتے۔ میں نے اُس زمانہ میں انہیں کبھی کاغذ قلم لیکر فکرِ سخن کرتے نہیں دیکھا۔ موزوں الفاظ کا ایک دریا بہتا یا ایک چشمہ اُبلتا معلوم ہوتا تھا۔ ایک خاص کیفیت رقت کی عموماً اُن پر طاری ہوتی تھی۔ اپنے اشعار سُریلی آواز میں ترنم سے پڑھتے تھے۔ خود وجد کرتے اور دوسروں کو وجد میں لاتے تھے۔ یہ عجیب خصوصیت ہے کہ حافظہ ایسا پایا ہے کہ جتنے شعر اس طرح زبان سے نکلیں اگر وہ ایک مسلسل نظم کے ہوں تو سب کے سب دوسرے وقت اور دوسرے دن اسی ترتیب سے حافظہ میں محفوظ ہوتے ہیں جس ترتیب سے وہ کہے گئے تھے۔ اور درمیان میں خود وہ انہیں قلمبند بھی نہیں کرتے۔ مجھے بہت سے شعرا کی ہم نشینی کا موقعہ ملا ہے اور بعض کو میں نے شعر کہتے بھی دیکھا اور سُنا ہے۔ مگر یہ رنگ کسی اور میں نہیں دیکھا۔ اقبال کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ بایں ہمہ موزونیٔ طبع وہ حسب فرمایش شعر کہنے سے قاصر ہے۔ جب طبیعت خود مائلِ نظم ہو تو جتنے شعر چاہے کہہ دے۔ مگر یہ کہ ہر وقت اور ہر موقع پر حسب فرمایش وہ کچھ لکھ سکے۔ یہ قریب قریب ناممکن ہے۔ اسی لئے جب ان کا نام نکلا اور فرمایشوں کی بھرمار ہوئی تو انہیں اکثر فرمایشوں کی تعمیل سے انکار ہی کرنا پڑا۔ اسی طرح انجمنوں اور مجالس کو بھی وہ عموماً جواب ہی دیتے رہے۔ فقط لاہور کی انجمن حمایت اسلام کو بعض وجوہ کے سبب یہ موقع ملا کہ اس کے سالانہ جلسوں میں کئی سال متواتر اقبال نے اپنی نظم سنائی جو خاص اُسی جلسہ کے لئے لکھی جاتی تھی اور جس کی فکر وہ پہلے سے کرتے رہتے تھے۔

اول اول جو نظمیں جلسۂ عام میں پڑھی جاتی تھیں۔ تحت اللفظ پڑھی جاتی تھیں اور اُس طرز میں بھی ایک لطف تھا۔ مگر بعض دوستوں نے ایک مرتبہ جلسۂ عام میں شیخ محمد اقبال سے بہ اصرار کہا کہ وہ نظم ترنم سے پڑھیں۔ اُن کی آواز قدرتاً بلند اور خوش آئند ہے۔

صبح اٹھتے ہی جو مجھ سے ملے تو دو تازہ غزلیں فارسی میں تیار تھیں جو انہوں نے زبانی مجھے سنائیں۔ ان غزلوں کے کہنے سے انہیں اپنی فارسی گوئی کی قوت کا حال معلوم ہوا۔ جس کا پہلے انہوں نے اس طرح امتحان نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد ولایت سے واپس آنے پر گو کبھی کبھی اردو کی نظمیں بھی کہتے تھے۔ مگر طبیعت کا رُخ فارسی کی طرف ہو گیا۔ یہ اُن کی شاعری کا تیسرا دور ہے جو ۱۹۰۸ء کے بعد سے شروع ہوا اور جو اب تک چل رہا ہے۔ اس عرصہ میں اردو نظمیں بھی بہت سی ہوئیں اور اچھی اچھی۔ جن کی دھوم مچ گئی۔ مگر اصل کام جس کی طرف وہ متوجہ ہو گئے۔ وہ ان کی فارسی مثنوی "اسرارِ خودی" تھی۔ اس کا خیال دیر تک اُنکے دماغ میں رہا اور رفتہ رفتہ دماغ سے صفحۂ قرطاس پر اُترنے لگا۔ اور آخر ایک مستقل کتاب کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ جس سے اقبال کا نام ہندوستان سے باہر بھی مشہور ہو گیا۔

فارسی میں اقبال کے قلم سے تین کتابیں اس وقت تک نکلی ہیں "اسرارِ خودی" "رموزِ بیخودی" اور "پیامِ مشرق"۔ ایک سے ایک بہتر۔ پہلی کتاب سے دوسری میں زبان زیادہ سادہ اور عام فہم ہو گئی ہے اور تیسری دوسری سے زیادہ سلیس ہے۔ جو لوگ اقبال کے اردو کلام کے دلدادہ ہیں وہ فارسی نظموں کو دیکھ کر مایوس ہوئے ہونگے۔ مگر انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ فارسی نے وہ کام کیا جو اردو سے نہیں ہو سکتا تھا۔ تمام اسلامی دنیا میں جہاں فارسی کم و بیش متداول ہے اقبال کا کلام اس ذریعہ سے پہنچ گیا اور اس میں ایسے خیالات تھے جن کی ایسی وسیع اشاعت ضروری تھی۔ اور اسی وسیلے سے یورپ اور امریکہ والوں کو ہمارے ایسے قابلِ قدر مصنف کا حال معلوم ہوا۔ "پیامِ مشرق" میں ہمارے مصنف نے یورپ کے ایک نہایت بلند پایہ شاعر گوئٹے کے "سلامِ مغرب" کا جواب لکھا ہے۔ اور اس میں نہایت حکیمانہ خیالات کا اظہار بہت خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔ اس کے اشعار میں بعض بڑے بڑے

عقدے حل ہوئے ہیں جو پہلے ایسے آسان طریق سے بیان نہیں ہوئے تھے۔ مدت سے بعض رسائل اور اخبارات میں ڈاکٹر محمد اقبال کو "ترجمانِ حقیقت" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور ان کتابوں کے خاص خاص اشعار سے یہ ثابت ہے کہ وہ اس لقب سے ملقب ہونے کے مستحق ہیں اور جس کسی نے یہ لقب ان کے لئے پہلے وضع کیا ہے اس نے کوئی مبالغہ نہیں کیا۔

فارسی گوئی کا ایک اثر اقبال کے اردو کلام پر یہ ہوا ہے کہ جو نظمیں اردو میں دورِ سوم میں لکھی گئی ہیں۔ اُن میں سے اکثر میں فارسی ترکیبیں اور فارسی بندشیں پہلے سے بھی زیادہ ہیں اور بعض جگہ فارسی اشعار پر تضمین کی گئی ہے۔ گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اشہبِ قلم جو فارسی کے میدان میں گام زن ہے اس کی باگ کسی قدر تکلف کے ساتھ اردو کی طرف موڑی جارہی ہے۔

اقبال کا اردو کلام جو وقتاً فوقتاً ۱۹۰۱ء سے لیکر آج تک رسالوں اور اخباروں میں شایع ہوا اور انجمنوں میں پڑھا گیا۔ اُس کے مجموعہ کی اشاعت کے بہت لوگ خواہاں تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے احباب بار ہا تقاضا کرتے تھے کہ اردو کلام کا مجموعہ شایع کیا جائے مگر کئی وجوہات سے آج تک مجموعۂ اردو شایع نہیں ہو سکا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ آخر اب شائقینِ کلامِ اردو کی یہ دیرینہ آرزو بر آئی۔ اور اقبال کی اردو نظموں کا مجموعہ شایع ہوتا ہے جو تین سو چھتیس صفحوں پر مشتمل ہے۔ اور تین حصوں پر منقسم ہے۔ حصہ اول میں ۱۹۰۵ء تک کی نظمیں ہیں۔ حصہ دوم میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کی اور حصۂ سوم میں ۱۹۰۸ء سے لیکر آج تک کا اردو کلام ہے۔ یہ دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں آج تک کوئی ایسی کتابِ اشعار کی موجود نہیں ہے۔ جس میں خیالات کی یہ فراوانی ہو اور اس قدر مطالب و معانی یکجا ہوں۔ اور کیوں نہ ہو۔ ایک صدی کے چہارم حصہ کے مطالعہ اور تجربہ

اور مشاہدہ کا نچوڑ اور سیر و سیاحت کا نتیجہ ہے۔ بعض نظموں میں ایک ایک شعر اور ایک ایک مصرعہ ایسا ہے کہ اس پر ایک مستقل مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ یہ مختصر سا مضمون جو بطور دیباچہ لکھا گیا ہے۔ اس میں مختلف نظموں کی تنقید یا مختلف اوقات کی نظموں کے باہم مقابلہ کی گنجایش نہیں۔ اس کے لئے اگر ہو سکا تو میں کوئی اور موقعہ تلاش کروں گا۔ سرِ دست میں صاحبانِ ذوق کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اردو کلیاتِ اقبال اُن کے سامنے رسالوں اور گلدستوں کے اوراقِ پریشاں سے نکل کر ایک مجموعۂ دلپذیر کی شکل میں جلوہ گر ہے۔ اور امید ہے کہ جو لوگ مدت سے اس کلام کو یکجا دیکھنے کے مشتاق تھے وہ اس مجموعہ کو شوق کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ اور دل سے اس کی قدر کریں گے۔

آخر میں اردو شاعری کی طرف سے میں یہ درخواست قابل مصنف سے کرتا ہوں کہ وہ اپنے دل و دماغ سے اردو کو وہ حصہ دیں جس کی وہ مستحق اور محتاج ہے۔ خود انہوں نے غالب کی تعریف میں چند بند لکھے ہیں جن میں ایک شعر میں اردو کی حالت کا صحیح نقشہ کھینچا ہے

گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے

شمع یہ سودائیِ دل سوزیِ پروانہ ہے

ہم اُن کا یہ شعر پڑھ کر اُن سے یہ کہتے ہیں کہ جس احساس نے یہ شعر اُن سے نکلوایا تھا اس سے کام لیکر اب وہ پھر کچھ عرصہ کے لئے گیسوئے اردو کے سنوارنے کی طرف متوجہ ہوں اور ہمیں موقعہ دیں کہ ہم اسی مجموعۂ اردو کو جو اس قدر دیر کے بعد چھپا ہے۔ ایک دوسرے کلیاتِ اردو کا پیش خیمہ سمجھیں ﴿

حصّۂ اوّل

(۔۔۔۔۔ سنہ ۱۹۰۵ء تک)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حصۂ اوّل

ہمالہ

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں! چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں

ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لئے

امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو پاسباں اپنا ہے تو، دیوارِ ہندوستاں ہے تو
مطلعِ اوّل فلک جس کا ہو وہ دیواں ہے تو سوئے خلوت گاہِ دل دامن کشِ انساں ہے تو

برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالم تاب پر

تیری عمرِ رفتہ کی اک آن ہے عہدِ کہن
وادیوں میں ہیں تری کالی گھٹائیں خیمہ زن

چوٹیاں تیری ثریا سے ہیں سرگرمِ سخن
تو زمیں پر اور پہنائے فلک تیرا وطن

چشمۂ دامن ترا آئینۂ سیّال ہے
دامنِ موجِ ہوا جس کے لئے رومال ہے

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے
تازیانہ دے دیا برقِ سرِ کوہسار نے

اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے
دستِ قدرت نے بنایا ہے عناصر کیلئے

ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیلِ بے زنجیر کی صورت اُڑا جاتا ہے ابر

جنبشِ موجِ نسیمِ صبح گہوارہ بنی
جھومتی ہے نشۂ ہستی میں ہر گل کی کلی

یوں زبانِ برگ سے گویا ہے اُسکی خامشی
دستِ گلچیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی

کہہ رہی ہے میری خاموشی ہی افسانہ مرا
کنجِ خلوت خانۂ قدرت ہے کاشانہ مرا

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئنہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی
سنگِ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی

چھیڑتی جا اس عراقِ دلنشیں کے ساز کو
اے مسافر! دل سمجھتا ہے تری آواز کو

لیلیٔ شب کھولتی ہے آکے جب زلفِ رسا
دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا
وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا

کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

اے ہمالہ! داستاں اُس وقت کی کوئی سُنا
مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اُس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا
داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا

ہاں دکھا دے اے تصور! پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

گلِ رنگیں

تو شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں
اے گلِ رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں

زیبِ محفل ہے، شریکِ شورشِ محفل نہیں
یہ فراغت بزمِ ہستی میں مجھے حاصل نہیں

اس چمن میں میں سراپا سوز و سازِ آرزو
اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو

توڑ لینا شاخ سے تجھ کو مرا آئیں نہیں
یہ نظر غیر از نگاہِ چشمِ صورت بیں نہیں

آہ! یہ دستِ جفا جو اے گلِ رنگیں نہیں
کس طرح تجھ کو یہ سمجھاؤں کہ میں گلچیں نہیں

کام مجھ کو دیدۂ حکمت کے الجھیڑوں سے کیا
دیدۂ بلبل سے میں کرتا ہوں نظارہ ترا

سوز بانوں پہ بھی خاموشی تجھے منظور ہے　　راز وہ کیا ہے ترے سینے میں جو مستور ہے

میری صورت تو بھی اک برگِ ریاضِ طور ہے　　میں چمن سے دُور ہوں تو بھی چمن سے دُور ہے

مطمئن ہے تُو پریشاں مثلِ بُو رہتا ہوں میں
زخمیٔ شمشیرِ ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں

یہ پریشانی مری سامانِ جمعیت نہ ہو　　یہ جگرسوزی چراغِ خانۂ حکمت نہ ہو

ناتوانی ہی مری سرمایۂ قوت نہ ہو　　رشکِ جامِ جم مرا آئینۂ حیرت نہ ہو

یہ تلاشِ متصل شمعِ جہاں افروز ہے
توسنِ ادراکِ انساں کو خرام آموز ہے

عہدِ طفلی

تھے دیارِ نو زمین و آسماں میرے لئے — وسعتِ آغوشِ مادر اک جہاں میرے لئے
تھی ہر اک جنبش نشانِ لطفِ جاں میرے لئے — حرفِ بے مطلب تھی خود میری زباں میرے لئے
دردِ طفلی میں اگر کوئی رُلاتا تھا مجھے
شورشِ زنجیرِ در میں لطف آتا تھا مجھے

تکتے رہنا ہائے! وہ پہروں تلک سوئے قمر — وہ پھٹے بادل میں بے آوازِ پا اُس کا سفر
پوچھنا رہ رہ کے اُسکے کوہ و صحرا کی خبر — اور وہ حیرت دروغِ مصلحت آمیز پر!
آنکھ وقفِ دید تھی لب مائلِ گفتار تھا
دل نہ تھا میرا سراپا ذوقِ استفسار تھا

مرزا غالب

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا

تھا سراپا روح تو، بزمِ سخن پیکر ترا
زیبِ محفل بھی رہا، محفل سے پنہاں بھی رہا

دید تیری آنکھ کو اُس حُسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

محفلِ ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار
جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار

تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار
تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ وار

زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر

شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلی گلِ شیراز پر

آہ! تو اجڑی ہوئی دِلّی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہمنشیں

ہائے! اب کیا ہو گئی ہندوستاں کی سر زمیں!
آہ! اے نظّارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں!

گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائیِ دل سوزیِ پروانہ ہے

اے جہان آباد! اے گہوارۂ علم و ہنر
ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در

ذرّے ذرّے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر
یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر

دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے؟

ویمر۔ جرمنی کا مشہور شاعر گوئٹے اس جگہ مدفون ہے۔

ابرِ کوہسار

ہے بلندی سے فلک بوس نشیمن میرا
ابرِ کہسار ہوں گل پاش ہے دامن میرا
کبھی صحرا کبھی گلزار ہے مسکن میرا
شہر و ویرانہ مرا، بحر مرا، بن میرا

کسی وادی میں جو منظور ہو سونا مجھ کو
سبزۂ کوہ ہے مخمل کا بچھونا مجھ کو

مجھ کو قدرت نے سکھایا ہے دُر افشاں ہونا
ناقۂ شاہدِ رحمت کا حُدی خواں ہونا
غم زدائے دلِ افسردۂ دہقاں ہونا
رونقِ بزمِ جوانانِ گلستاں ہونا

بن کے گیسو رُخِ ہستی پہ بکھر جاتا ہوں
شانۂ موجۂ صرصر سے سنور جاتا ہوں

دور سے دیدۂ امید کو ترساتا ہوں
کسی بستی سے جو خاموش گذر جاتا ہوں
سیر کرتا ہوا جس دم لبِ جُو آتا ہوں
بالیاں نہر کو گرداب کی پہناتا ہوں

سبزۂ مزرعِ نوخیز کی امید ہوں میں
زادۂ بحر ہوں - پروردۂ خورشید ہوں میں
چشمۂ کوہ کو دی شورشِ قلزم میں نے — اور پرندوں کو کیا محوِ ترنّم میں نے
سر پہ سبزہ کے کھڑے ہو کے کہا قُم میں نے — غنچۂ گل کو دیا ذوقِ تبسّم میں نے
فیض سے میرے نمونے ہیں شبستانوں کے
جھونپڑے دامنِ کہسار میں دہقانوں کے

ایک مکڑا اور مکھی

(ماخوذ)

بچوں کے لئے

اک دن کسی مکھی سے یہ کہنے لگا مکڑا — اِس راہ سے ہوتا ہے گذر روز تمہارا
لیکن مری کٹیا کی نہ جاگی کبھی قسمت — بھولے سے کبھی تم نے یہاں پاؤں نہ رکھا

غیروں سے نہ ملئے تو کوئی بات نہیں ہے
اپنوں سے مگر چاہئے یوں کھنچ کے نہ رہنا

آؤ جو مرے گھر میں تو عزت ہے یہ میری
وہ سامنے سیڑھی ہے جو منظور ہو آنا

مکھی نے سُنی بات جو مکڑے کی تو بولی
حضرت! کسی ناداں کو دیجے گا یہ دھوکا!

اِس جال میں مکھی کبھی آنے کی نہیں ہے
جو آپ کی سیڑھی پہ چڑھا۔ پھر نہیں اُترا

مکڑے نے کہا۔ واہ۔ فریبی مجھے سمجھے
تم سا کوئی ناداں زمانے میں نہ ہوگا

منظور تمہاری مجھے خاطر تھی۔ و گرنہ
کچھ فائدہ اپنا تو مرا اِس میں نہیں تھا

اُڑتی ہوئی آئی ہو خدا جانے کہاں سے
ٹھیرو جو مرے گھر میں تو ہے اِس میں بُرا کیا؟

اِس گھر میں کئی تم کو دکھانے کی ہیں چیزیں
باہر سے نظر آتا ہے چھوٹی سی یہ کٹیا

لٹکے ہوئے دروازوں پہ باریک ہیں پردے
دیواروں کو آئینوں سے ہے میں نے سجایا

مہمانوں کے آرام کو حاضر ہیں بچھونے
ہر شخص کو ساماں یہ میسر نہیں ہوتا

مکھی نے کہا۔ خیر! یہ سب ٹھیک ہے لیکن
میں آپ کے گھر آؤں۔ یہ اُمید نہ رکھنا!

اِن نرم بچھونوں سے خدا مجھ کو بچائے
سو جائے کوئی اِن پہ تو پھر اُٹھ نہیں سکتا!

مکڑے نے کہا دل میں سُنی بات جو اُسکی — پھانسوں اِسے کس طرح یہ کمبخت ہے دانا
سو کام خوشامد سے نکلتے ہیں جہاں میں — دیکھو جسے دنیا میں خوشامد کا ہے بندا
یہ سوچ کے مکھی سے کہا اس نے بڑی بی! — اللہ نے بخشا ہے بڑا آپ کو رُتبا!
ہوتی ہے اُسے آپ کی صورت سے محبت — ہو جس نے کبھی ایک نظر آپ کو دیکھا
آنکھیں ہیں کہ ہیرے کی چمکتی ہوئی کنیاں — سر آپ کا اللہ نے کلغی سے سجایا
یہ حسن، یہ پوشاک، یہ خوبی، یہ صفائی! — پھر اس پہ قیامت ہے یہ اُڑتے ہوئے گانا
مکھی نے سُنی جب یہ خوشامد تو پسیجی — بولی کہ نہیں آپ سے مجکو کوئی کھٹکا
انکار کی عادت کو سمجھتی ہوں بُرا میں — سچ یہ ہے کہ دل توڑنا اچھا نہیں ہوتا
یہ بات کہی اور اُڑی اپنی جگہ سے — پاس آئی تو مکڑے نے اُچھل کر اُسے پکڑا
بھوکا تھا کئی روز سے اب ہاتھ جو آئی — آرام سے گھر بیٹھ کے مکھی کو اُڑایا

ایک پہاڑ اور گلہری

(ماخوذ از ایمرسن)

بچوں کے لئے

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے
تجھے ہو شرم۔ تو پانی میں جاکے ڈوب مرے

ذرا سی چیز ہے۔ اِس پر غرور! کیا کہنا!
یہ عقل اور یہ سمجھ۔ یہ شعور! کیا کہنا!

خدا کی شان ہے ناچیز چیز بن بیٹھیں!
جو بے شعور ہوں یوں باتمیز بن بیٹھیں!

تری بساط ہے کیا میری شان کے آگے؟
زمیں ہے پست مری آن بان کے آگے

جو بات مجھ میں ہے تجھ کو وہ ہے نصیب کہاں
بھلا پہاڑ کہاں جانور غریب کہاں!

کہا یہ سُن کے گلہری نے۔ مُنہ سنبھال ذرا!
یہ کچی باتیں ہیں دل سے انہیں نکال ذرا!

جو میں بڑی نہیں تیری طرح تو کیا پروا؟
نہیں ہے تو بھی تو آخر مری طرح چھوٹا

ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے
کوئی بڑا، کوئی چھوٹا، یہ اسکی حکمت ہے

بڑا جہان میں تجھکو بنا دیا اُس نے
مجھے درخت پہ چڑھنا سکھا دیا اُس نے

قدم اُٹھانے کی طاقت نہیں ذرا تجھ میں
نری بڑائی ہے! خوبی ہے اور کیا تجھ میں؟

جو تُو بڑا ہے تو مجھ سا ہنر دکھا مجھ کو
یہ چھالیا ہی ذرا توڑ کر دکھا مجھ کو

نہیں ہے چیز نکمّی کوئی زمانے میں
کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

ایک گائے اور بکری

(ماخوذ)

بچوں کے لئے

اک چراگاہ ہری بھری تھی کہیں
تھی سراپا بہار جس کی زمیں

کیا سماں اس بہار کا ہو بیاں
ہر طرف صاف ندیاں تھیں رواں

تھے اناروں کے بے شمار درخت — اور پیپل کے سایہ دار درخت

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں — طائروں کی صدائیں آتی تھیں

کسی ندی کے پاس اِک بکری — چرتے چرتے کہیں سے آ نکلی

جب ٹھہر کر اِدھر اُدھر دیکھا — پاس اِک گائے کو کھڑے پایا

پہلے جھک کر اُسے سلام کیا — پھر سلیقے سے یوں کلام کیا

کیوں بڑی بی! مزاج کیسے ہیں؟ — گائے بولی کہ خیر اچھے ہیں

کٹ رہی ہے بُری بھلی اپنی — ہے مصیبت میں زندگی اپنی

جان پر آبنی ہے۔ کیا کہیئے؟ — اپنی قسمت بُری ہے۔ کیا کہیئے؟

دیکھتی ہوں خدا کی شان کو میں — رو رہی ہوں بُروں کی جان کو میں

زور چلتا نہیں غریبوں کا — پیش آیا لکھا نصیبوں کا

آدمی سے کوئی بھلا نہ کرے — اس سے پالا پڑے خدا نہ کرے!

دودھ کم دوں تو بُڑبُڑاتا ہے — ہوں جو دُبلی، تو بیچ کھاتا ہے

ہتھکنڈوں سے غلام کرتا ہے!   کن فریبوں سے رام کرتا ہے!

اس کے بچوں کو پالتی ہوں میں   دودھ سے جان ڈالتی ہوں میں

بدلے نیکی کے یہ بُرائی ہے   میرے اللہ! تری دُہائی ہے!!

سُن کے بکری یہ ماجرا سارا   بولی، ایسا گِلہ نہیں اچھا

بات سچّی ہے بے مزا لگتی   میں کہوں گی مگر خدا لگتی

یہ چراگہ، یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا   یہ ہری گھاس اور یہ سایا

ایسی خوشیاں ہمیں نصیب کہاں!   یہ کہاں، بے زباں غریب کہاں!

یہ مزے آدمی کے دم سے ہیں   لطف سارے اسی کے دم سے ہیں

اس کے دم سے ہے اپنی آبادی   قید ہم کو بھلی، کہ آزادی!

سو طرح کا بنوں میں ہے کھٹکا   واں کی گزران سے بچائے خدا!

ہم پہ احسان ہے بڑا اس کا   ہم کو زیبا نہیں گلہ اس کا

قدر آرام کی اگر سمجھو   آدمی کا کبھی گلہ نہ کرو

گائے سُن کر یہ بات شرمائی
آدمی کے گلے سے پچتائی

دل میں پر کھا بھلا بُرا اس نے
اور کچھ سوچ کر کہا اس نے

یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی
دل کو لگتی ہے بات بکری کی!

بچّے کی دعا

(ماخوذ)

بچّوں کے لئے

لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنّا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری!

دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے!
ہر جگہ میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے!

ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

زندگی ہو مری پروانے کی صورت یارب! | علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب!
ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا | دردمندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

مرے اللہ! برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو

ہمدردی

(ماخوذ از ولیم کوپر)

بچّوں کے لئے

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا | بلبل تھا کوئی اُداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی | اڑنے چگنے میں دن گذارا
پہنچوں کس طرح آشیاں تک | ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا
سنکر بلبل کی آہ وزاری | جگنو کوئی پاس ہی سے بولا

حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے | کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری | میں راہ میں روشنی کروں گا
اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل | چمکا کے مجھے دیا بنایا

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

ماں کا خواب

(ماخوذ)

بچوں کے لئے

میں سوئی جو اک شب تو دیکھا یہ خواب | بڑھا اور جس سے مرا اضطراب
یہ دیکھا کہ میں جا رہی ہوں کہیں | اندھیرا ہے اور راہ ملتی نہیں
لرزتا تھا ڈر سے مرا بال بال | قدم کا تھا دہشت سے اٹھنا محال

جو کچھ حوصلہ پا کے آگے بڑھی
تو دیکھا قطار ایک لڑکوں کی تھی

زمرد سی پوشاک پہنے ہوئے
دیئے سب کے ہاتھوں میں جلتے ہوئے

وہ چپ چاپ تھے آگے پیچھے رواں
خدا جانے جانا تھا اُن کو کہاں!

اسی سوچ میں تھی کہ میرا پسر
مجھے اس جماعت میں آیا نظر

وہ پیچھے تھا اور تیز چلتا نہ تھا
دیا اس کے ہاتھوں میں جلتا نہ تھا

کہا میں نے پہچان کر میری جاں!
مجھے چھوڑ کر آ گئے تم کہاں؟

جدائی میں رہتی ہوں میں بیقرار
پروتی ہوں ہر روز اشکوں کے ہار

نہ پروا ہماری ذرا تم نے کی
گئے چھوڑ، اچھی وفا تم نے کی!

جو بچے نے دیکھا مرا پیچ و تاب
دیا اس نے منہ پھیر کر یوں جواب

رُلاتی ہے تجھ کو جدائی مری
نہیں اس میں کچھ بھی بھلائی مری

یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک چپ رہا
دیا پھر دکھا کر یہ کہنے لگا

سمجھتی ہے تو ہو گیا کیا اسے؟
ترے آنسوؤں نے بجھایا اسے!

پرندے کی فریاد

بچوں کے لئے

آتا ہے یاد مجھکو گذرا ہوا زمانا
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا

آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا

لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم
شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا

وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت
آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانا

آتی نہیں صدائیں اس کی مرے قفس میں
ہوتی مری رہائی اے کاش میرے بس میں!

کیا بدنصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں
ساتھی تو ہیں وطن میں میں قید میں پڑا ہوں

آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں
میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں

اس قید کا الٰہی دُکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہے یہیں قفس میں میں غم سے مر نہ جاؤں
جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے
دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے
گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے
دُکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے
آزاد مجکو کردے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے!

خفتگانِ خاک سے استفسار

مہرِ روشن چھپ گیا۔ اُٹھی نقابِ روئے شام
شانۂ ہستی پہ ہے بکھرا ہوا گیسوئے شام
یہ سیہ پوشی کی تیاری کسی کے غم میں ہے
محفلِ قدرت مگر خورشید کے ماتم میں ہے
کر رہا ہے آسماں جادو لبِ گفتار پر
ساحرِ شب کی نظر ہے دیدۂ بیدار پر
غوطہ زن دریائے خاموشی میں ہے موجِ ہوا
ہاں مگر اک دور سے آتی ہے آوازِ درا

دل کہ ہے بیتابیِ الفت میں دنیا سے نفور
کھینچ لایا ہے مجھے ہنگامۂ عالم سے دور

منظرِ حرماں نصیبی کا تماشائی ہوں میں
ہم نشینِ خفتگانِ کنجِ تنہائی ہوں میں

تھم ذرا بیتابیِ دل! بیٹھ جانے دے مجھے
اور اس بستی پہ چار آنسو گرانے دے مجھے

اے مےِ غفلت کے سر مستو! کہاں رہتے ہو تم؟
کچھ کہو اس دیس کی آخر جہاں رہتے ہو تم

وہ بھی حیرت خانۂ امروز و فردا ہے کوئی؟
اور پیکارِ عناصر کا تماشا ہے کوئی؟

آدمی واں بھی حصارِ غم میں ہے محصور کیا؟
اس ولایت میں بھی ہے انساں کا دل مجبور کیا؟

واں بھی جل مرتا ہے سوزِ شمع پر پروانہ کیا؟
اس چمن میں بھی گل و بلبل کا ہے افسانہ کیا؟

یاں تو اک مصرع میں پہلو سے نکل جاتا ہے دل
شعر کی گرمی سے کیا واں بھی پگل جاتا ہے دل؟

رشتہ و پیوندیاں کے جان کا آزار ہیں
اس گلستاں میں بھی کیا ایسے نکیلے خار ہیں؟

اس جہاں میں اک معیشت اور سو افتاد ہے
روح کیا اس دیس میں اس فکر سے آزاد ہے؟

کیا وہاں بجلی بھی ہے، دہقاں بھی ہے، خرمن بھی ہے؟
قافلے والے بھی ہیں؟ اندیشۂ رہزن بھی ہے؟

تنکے چنتے ہیں وہاں بھی آشیاں کیواسطے؟   خشت و گِل کی فکر ہوتی ہے مکاں کیواسطے؟

واں بھی انساں اپنی اصلیت سے بیگانے ہیں کیا؟   امتیازِ ملت و آئیں کے دیوانے ہیں کیا؟

واں بھی کیا فریادِ بلبل پر چمن روتا نہیں؟
اس جہاں کی طرح واں بھی دردِ دل ہوتا نہیں؟

باغ ہے فردوس یا اک منزلِ آرام ہے؟   یا رخِ بے پردۂ حسنِ ازل کا نام ہے؟

کیا جہنم معصیت سوزی کی اک ترکیب ہے؟   آگ کے شعلوں میں پنہاں مقصدِ تادیب ہے؟

کیا عوض رفتار کے اس دیس میں پرواز ہے؟   موت کہتے ہیں جسے اہلِ زمیں، کیا راز ہے؟

اضطرابِ دل کا ساماں یاں کی ہست و بود ہے   علمِ انساں اُس ولایت میں بھی کیا محدود ہے؟

دید سے تسکین پاتا ہے دلِ مہجور بھی؟   لن ترانی کہہ رہے ہیں یا وہاں کے طور بھی؟

جستجو میں ہے وہاں بھی روح کو آرام کیا؟   واں بھی انساں ہے قتیلِ ذوقِ استفہام کیا؟

آہ! وہ کشور بھی تاریکی سے کیا معمور ہے؟   یا محبت کی تجلی سے سراپا نور ہے؟

تم بتا دو راز جو اس گنبدِ گرداں میں ہے   موت اک چبھتا ہوا کانٹا دلِ انساں میں ہے

شمع و پروانہ

پروانہ تجھ سے کرتا ہے اے شمع پیار کیوں؟
یہ جانِ بیقرار ہے تجھ پر نثار کیوں؟

سیماب وار رکھتی ہے تیری ادا اسے
آدابِ عشق تونے سکھائے ہیں کیا اسے؟

کرتا ہے یہ طواف تری جلوہ گاہ کا
پھونکا ہوا ہے کیا تری برقِ نگاہ کا؟

آزارِ موت میں اسے آرامِ جاں ہے کیا؟
شعلے میں تیرے زندگیِ جاوداں ہے کیا؟

غم خانۂ جہاں میں جو تیری ضیا نہ ہو
اس تفتہ دل کا نخلِ تمنا ہرا نہ ہو

گرنا ترے حضور میں اس کی نماز ہے
ننھے سے دل میں لذّتِ سوز و گداز ہے

کچھ اس میں جوشِ عاشقِ حسنِ قدیم ہے
چھوٹا سا طور تُو، یہ ذرا سا کلیم ہے

پروانہ اور ذوقِ تماشائے روشنی!
کیڑا ذرا سا اور تمنائے روشنی!

عقل و دل

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا
بھولے بھٹکے کی رہنما ہوں میں

ہوں زمیں پر، گذر فلک پہ مرا
دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں

کام دنیا میں رہبری ہے مرا
مثلِ خضرِ خجستہ پا ہوں میں

ہوں مفسّر کتابِ ہستی کی
مظہرِ شانِ کبریا ہوں میں

بوند اک خون کی ہے تُو لیکن
غیرتِ لعلِ بے بہا ہوں میں

دل نے سن کر کہا یہ سب سچ ہے
پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں میں!

رازِ ہستی کو تو سمجھتی ہے
اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں

ہے تجھے واسطہ مظاہر سے
اور باطن سے آشنا ہوں میں

علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے
تو خدا جُو، خدا نما ہوں میں

علم کی انتہا ہے بے تابی
اس مرض کی مگر دوا ہوں میں

شمع تو محفلِ صداقت کی — حسن کی بزم کا دِیا ہوں میں
تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا — طائرِ سدرہ آشنا ہوں میں
کس بلندی پہ ہے مقام مرا
عرش ربِّ جلیل کا ہوں میں

صدائے درد

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے — ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے
سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے — وصل کیسا یاں تو اک قربِ فراق آمیز ہے
بدلے یکرنگی کے یہ ناآشنائی ہے غضب — ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب
جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں — اس چمن میں کوئی لطفِ نغمہ پیرائی نہیں
لذتِ قربِ حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں
اختلاطِ موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں

دانۂ خرمن نما ہے شاعرِ معجز بیاں　　ہو نہ خرمن ہی تو اس دانے کی ہستی پھر کہاں

حسن ہو کیا خود نما جب کوئی مائل ہی نہ ہو　　شمع کو جلنے سے کیا مطلب جو محفل ہی نہ ہو

ذوقِ گویائی خموشی سے بدلتا کیوں نہیں　　میرے آئینہ سے یہ جوہر نکلتا کیوں نہیں

کب زباں کھولی ہماری لذتِ گفتار نے

پھونک ڈالا جب چمن کو آتشِ پیکار نے

آفتاب

(ترجمہ گایتری)

اے آفتاب! روح و روانِ جہاں ہے تو　　شیرازہ بندِ دفترِ کون و مکاں ہے تو

باعث ہے تو وجود و عدم کی نمود کا　　ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بود کا

قائم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے　　ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے

ہر شے کو تیری جلوہ گری سے ثبات ہے　　تیرا یہ سوز و ساز سراپا حیات ہے

وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے
دل ہے، خرد ہے، روحِ رواں ہے شعور ہے

اے آفتاب ہم کو ضیائے شعور دے
چشمِ خرد کو اپنی تجلّی سے نور دے

ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تو
یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز تو

تیرا کمال ہستیِ ہر جاندار میں
تیری نمود سلسلۂ کوہسار میں

ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو
زائیدگانِ نور کا ہے تاجدار تو

نے ابتدا کوئی، نہ کوئی انتہا تری
آزادِ قیدِ اوّل و آخر ضیا تری

شمع

بزمِ جہاں میں میں بھی ہوں اے شمع! دردمند   فریاد در گرہ صفتِ دانۂ سپند

دی عشق نے حرارتِ سوزِ دروں تجھے   اور گل فروشِ اشکِ شفق گوں کیا مجھے

ہو شمعِ بزمِ عیش کہ شمعِ مزار تو
ہر حال اشکِ غم سے رہی ہمکنار تو

یک بیں تری نظر صفتِ عاشقانِ راز   میری نگاہ مایۂ آشوبِ امتیاز

کعبے میں بتکدے میں ہے یکساں تری ضیا   میں امتیازِ دیر و حرم میں پھنسا ہوا

ہے شان آہ کی ترے دودِ سیاہ میں
پوشیدہ کوئی دل ہے تری جلوہ گاہ میں؟

جلتی ہے تو کہ برقِ تجلی سے دور ہے   بیدرد تیرے سوز کو سمجھے کہ نور ہے

تو جل رہی ہے اور تجھے کچھ خبر نہیں   بینا ہے اور سوزِ دروں پر نظر نہیں

ہیں جوشِ اضطراب سے سیماب وار بھی   آگاہِ اضطرابِ دلِ بیقرار بھی

تھا یہ بھی کوئی نازِ کسی بے نیاز کا
احساس دیدیا مجھے اپنے گداز کا

یہ آگہی مری مجھے رکھتی ہے بیقرار   خوابیدہ اس شرر میں ہیں آتشکدے ہزار

یہ امتیازِ رفعت و پستی اسی سے ہے!   گل میں مہک، شراب میں مستی اسی سے ہے!

بستان و بلبل و گل و بو ہے یہ آگہی
اصلِ کشاکشِ من و تو ہے یہ آگہی

صبحِ ازل جو حسن ہوا دلستانِ عشق   آوازِ کُن ہوئی تپش آموزِ جانِ عشق

یہ حکم تھا کہ گلشنِ کُن کی بہار دیکھ   ایک آنکھ لیکے خوابِ پریشاں ہزار دیکھ

مجھ سے خبر نہ پوچھ حجابِ وجود کی   شامِ فراقِ صبح تھی میری نمود کی

وہ دن گئے کہ قید سے میں آشنا نہ تھا   زیبِ درختِ طور مرا آشیانہ تھا

قیدی ہوں اور قفس کو چمن جانتا ہوں میں   غربت کے غمکدے کو وطن جانتا ہوں میں

یادِ وطن فسردگیٔ بے سبب بنی
شوقِ نظر کبھی، کبھی ذوقِ طلب بنی

اے شمع! انتہائے فریبِ خیال دیکھ
مسجودِ ساکنانِ فلک کا مآل دیکھ!

مضمون فراق کا ہوں، ثریّا نشاں ہوں میں
آہنگِ طبعِ ناظمِ کون و مکاں ہوں میں

باندھا مجھے جو اس نے تو چاہی مری نمود
تحریر کر دیا سرِ دیوانِ ہست و بود

گوہر کو مشتِ خاک میں رہنا پسند ہے
بندش اگرچہ سست ہے، مضموں بلند ہے

چشمِ غلط نگر کا یہ سارا قصور ہے
عالم ظہورِ جلوۂ ذوقِ شعور ہے

یہ سلسلہ زمان و مکاں کا کمند ہے
طوقِ گلوئے حسنِ تماشا پسند ہے

منزل کا اشتیاق ہے، گم کردہ راہ ہوں
اے شمع! میں اسیرِ فریبِ نگاہ ہوں

صیاد آپ، حلقۂ دامِ ستم بھی آپ!
بامِ حرم بھی، طائرِ بامِ حرم بھی آپ!

میں حسن ہوں کہ عشقِ سراپا گداز ہوں؟
کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں؟

ہاں آشنائے لب ہو نہ رازِ کہن کہیں
پھر چھڑ نہ جائے قصۂ دار و رسن کہیں

ایک آرزو

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب!
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو!

مرتا ہوں خامشی پر، یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

آزاد فکر سے ہوں عزلت میں دن گزاروں
دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو

لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو

گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجکو جہاں نما ہو

ہو ہاتھ کا سرھانا سبزہ کا ہو بچھونا
شرمائے جس سے جلوت خلوت میں وہ ادا ہو

مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل
ننھے سے دل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو

آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو

پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سرخی لئے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم
امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو

بجلی چمک کے ان کو کٹیا مری دکھا دے
جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو

پچھلے پہر کی کوئل، وہ صبح کی مؤذن
میں اس کا ہمنوا ہوں، وہ میری ہمنوا ہو

کانوں پہ ہو نہ میرے دیر وحرم کا احساں
روزن ہی جھونپڑی کا مجکو سحر نما ہو

پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو، نالہ مری دعا ہو

اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

ہر دردمند دل کو رونا مرا رُلا دے
بیہوش جو پڑے ہیں شائد انہیں جگا دے

آفتابِ صبح

شورشِ میخانۂ انساں سے بالاتر ہے تو
زینتِ بزمِ فلک ہو جس سے وہ ساغر ہے تو

ہو دُرِ گوشِ عروسِ صبح وہ گوہر ہے تو
جس پہ سیمائے اُفق نازاں ہو وہ زیور ہے تو

صفحۂ ایام سے داغِ مدادِ شب مٹا!
آسماں سے نقشِ باطل کی طرح کوکب مٹا!

حسن تیرا جب ہوا بامِ فلک سے جلوہ گر
آنکھ سے اڑتا ہے یکدم خواب کی مے کا اثر

نور سے معمور ہو جاتا ہے دامانِ نظر
کھولتی ہے چشمِ ظاہر کو ضیا تیری مگر

ڈھونڈتی ہیں جس کو آنکھیں وہ تماشا چاہیے
چشمِ باطن جس سے کھل جائے وہ جلوا چاہیے

شوقِ آزادی کے دنیا میں نہ نکلے حوصلے
زندگی بھر قیدِ زنجیرِ تعلق میں رہے

زیر و بالا ایک ہیں تیری نگاہوں کیلئے
آرزو ہے کچھ اسی چشمِ تماشا کی مجھے

آنکھ میری اور کے غم میں سرشک آباد ہو!
امتیازِ ملت و آئیں سے دل آزاد ہو!

بستۂ رنگِ خصوصیت نہ ہو میری زباں
نوعِ انساں قوم ہو میری، وطن میرا جہاں

دیدۂ باطن پہ رازِ نظمِ قدرت ہو عیاں
ہو شناسائے فلک شمعِ تخیل کا دھواں

عقدۂ اضداد کی کاوش نہ تڑپائے مجھے!
حسنِ عشق انگیز ہر شے میں نظر آئے مجھے!

صدمہ آ جائے ہوا سے گل کی پتی کو اگر
اشک بن کر میری آنکھوں سے ٹپک جائے اثر

دل میں ہو سوزِ محبت کا وہ چھوٹا سا شرر
نور سے جس کے ملے رازِ حقیقت کی خبر

شاہدِ قدرت کا آئینہ ہو دل میرا نہ ہو!
سر میں جز ہمدردیِ انساں کوئی سودا نہ ہو!

تو اگر زحمت کشِ ہنگامۂ عالم نہیں
یہ فضیلت کا نشاں اے نیرِ اعظم نہیں!

اپنے حسنِ عالم آرا سے جو تو محرم نہیں
ہمسرِ یک ذرۂ خاکِ درِ آدم نہیں!

نورِ مسجودِ ملک گرمِ تماشا ہی رہا
اور تو منت پذیرِ صبحِ فردا ہی رہا

آرزو نورِ حقیقت کی ہمارے دل میں ہے
لیلیِٰ ذوقِ طلب کا گھر اسی محمل میں ہے

کس قدر لذت کشودِ عقدۂ مشکل میں ہے!
لطفِ صد حاصل ہماری سعیِ بےحاصل میں ہے

دردِ استفہام سے واقف ترا پہلو نہیں
جستجوئے رازِ قدرت کا شناسا تو نہیں

دردِ عشق

اے دردِ عشق! ہے گہرِ آب دار تو
نامحرموں میں دیکھ نہ ہو آشکار تو!

پنہاں تہِ نقاب تری جلوہ گاہ ہے
ظاہر پرست محفلِ نو کی نگاہ ہے

آئی نئی ہوا چمنِ ہست و بود میں
اے دردِ عشق! اب نہیں لذت نمود میں

ہاں! خود نمائیوں کی تجھے جستجو نہ ہو!
منت پذیر نالۂ بلبل کا تو نہ ہو!

خالی شرابِ عشق سے لالے کا جام ہو — پانی کی بوند گریۂ شبنم کا نام ہو

پنہاں درونِ سینہ کہیں راز ہو ترا — اشکِ جگر گداز نہ غماز ہو ترا

گویا زبانِ شاعرِ رنگیں بیاں نہ ہو — آوازِ نے میں شکوۂ فرقت نہاں نہ ہو

یہ دور نکتہ چیں ہے کہیں چھپ کے بیٹھ رہ
جس دل میں تو مکیں ہے وہیں چھپ کے بیٹھ رہ

غافل ہے تجھ سے حیرتِ علم آفریدہ دیکھ! — جویا نہیں تری نگہِ نارسیدہ دیکھ

رہنے دے جستجو میں خیالِ بلند کو — حیرت میں چھوڑ دیدۂ حکمت پسند کو

جس کی بہار تو ہو یہ ایسا چمن نہیں — قابل تری نمود کے یہ انجمن نہیں

یہ انجمن ہے کشتۂ نظارۂ مجاز — مقصد تری نگاہ کا خلوت سرائے راز

ہر دل مئے خیال کی مستی سے چور ہے
کچھ اور آجکل کے کلیموں کا طور ہے

گلِ پژمردہ

کس زباں سے اے گلِ پژمردہ تجھ کو گل کہوں
کس طرح تجھ کو تمنائے دلِ بلبل کہوں

تھی کبھی موجِ صبا گہوارۂ جنباں ترا
نام تھا صحنِ گلستاں میں گلِ خنداں ترا

تیرے احساں کا نسیمِ صبح کو اقرار تھا
باغ تیرے دم سے گویا طبلۂ عطار تھا

تجھ پہ برساتا ہے شبنم دیدۂ گریاں مرا
ہے نہاں تیری اداسی میں دلِ ویراں مرا

میری بربادی کی ہے چھوٹی سی اک تصویر تو
خواب میری زندگی تھی جس کی ہے تعبیر تو

ہمچو نَے از نیستانِ خود حکایت می کنم
بشنو اے گل! از جدائیہا شکایت می کنم!

سیّد کی لوحِ تربت

اے کہ تیرا مرغِ جاں تارِ نفس میں ہے اسیر
اے کہ تیری روح کا طائر قفس میں ہے اسیر

اس چمن کے نغمہ پیراؤں کی آزادی تو دیکھ
شہر جو اجڑا ہوا تھا اس کی آبادی تو دیکھ

فکر رہتی تھی مجھے جس کی وہ محفل ہے یہی
صبر و استقلال کی کھیتی کا حاصل ہے یہی

سنگِ تربت ہے مرا گرویدۂ تقریر دیکھ
چشمِ باطن سے ذرا اس لوح کی تحریر دیکھ

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیمِ دیں
ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں

وانہ کرنا فرقہ بندی کیلئے اپنی زباں
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں

وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ! کوئی دل نہ دُکھ جائے تری تقریر سے

محفلِ نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ
رنگ پر جو اب نہ آئیں ان فسانوں کو نہ چھیڑ

تو اگر کوئی مدبّر ہے تو سن میری صدا
ہے دلیری دستِ اربابِ سیاست کا عصا

عرضِ مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے
نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے

بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوّتِ فرماں روا کے سامنے بیباک ہے

ہو اگر ہاتھوں میں تیرے خامۂ معجز رقم
شیشۂ دل ہو اگر تیرا مثالِ جامِ جم

پاک رکھ اپنی زباں، تلمیذِ رحمانی ہے تو!
ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو!

سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے
خرمنِ باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

ماہِ نو

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقابِ نیل
ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے رُوئے آبِ نیل

طشتِ گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب
نشترِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصدِ آفتاب؟

چرخ نے بالی چرا لی ہے عروسِ شام کی؟
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی؟

قافلہ تیرا رواں بے منتِ بانگِ درا
گوشِ انساں سن نہیں سکتا تری آوازِ پا

گھٹنے بڑھنے کا سماں آنکھوں کو دکھلاتا ہی تو
ہے وطن تیرا کدھر؟ کس دیس کو جاتا ہی تو؟

ساتھ اے سیارۂ ثابت نما لیچل مجھے
خارِ حسرت کی خلش رکھتی ہی اب بیکل مجھے

نور کا طالب ہوں گھبراتا ہوں اس بستی میں میں
طفلکِ سیماب پا ہوں مکتبِ ہستی میں میں

انسان اور بزمِ قدرت

صبحِ خورشیدِ درخشاں کو جو دیکھا میں نے
بزمِ معمورۂ ہستی سے یہ پوچھا میں نے

پرتوِ مہر کے دم سے ہے اجالا تیرا
سیمِ سیال ہے پانی ترے دریاؤں کا

مہر نے نور کا زیور تجھے پہنایا ہے
تیری محفل کو اسی شمع نے چمکایا ہے

گل و گلزار ترے خلد کی تصویریں ہیں
یہ سبھی سورۂ والشمس کی تفسیریں ہیں

سرخ پوشاک ہے پھولوں کی، درختوں کی ہری
تیری محفل میں کوئی سبز کوئی لال پری

ہے ترے خیمۂ گردوں کی طلائی جھالر
بدلیاں لال سی آتی ہیں افق پر جو نظر

کیا بھلی لگتی ہے آنکھوں کو شفق کی لالی
مئے گلرنگ خمِ شام میں تو نے ڈالی

رتبہ تیرا ہے بڑا، شان بڑی ہے تیری
پردۂ نور میں مستور ہے ہر شے تیری

صبح اک گیت سراپا ہے تری سطوت کا
زیرِ خورشید نشاں تک بھی نہیں ظلمت کا

میں بھی آباد ہوں اس نور کی بستی میں مگر
جل گیا پھر مری تقدیر کا اختر کیونکر؟

نور سے دور ہوں ظلمت میں گرفتار ہوں میں
کیوں سیہ روز، سیہ بخت، سیہ کار ہوں میں؟

میں یہ کہتا تھا کہ آواز کہیں سے آئی
بامِ گردوں سے و یا صحنِ زمیں سے آئی

ہے ترے نور سے وابستہ مری بود و نبود
باغباں ہے تری ہستی پئے گلزارِ وجود

انجمن حسن کی ہے تو، تری تصویر ہوں میں
عشق کا تو ہے صحیفہ، تری تفسیر ہوں میں

میرے بگڑے ہوئے کاموں کو بنایا تو نے
بار جو مجھ سے نہ اٹھا، وہ اٹھایا تو نے

نورِ خورشید کی محتاج ہے ہستی میری
اور بے منتِ خورشید چمک ہے تیری

ہو نہ خورشید تو ویراں ہو گلستاں میرا
منزلِ عیش کی جا نام ہو زنداں میرا

آہ! اے رازِ عیاں کے نہ سمجھنے والے!
حلقۂ دامِ تمنا میں الجھنے والے

ہائے غفلت! کہ تری آنکھ ہے پابندِ مجاز
نازِ زیبا تھا تجھے، تو ہے مگر گرمِ نیاز

تو اگر اپنی حقیقت سے خبردار رہے
نہ سیہ روز رہے پھر نہ سیہ کار رہے

پیامِ صبح

(ماخوذ از لانگ فیلو)

اجالا جب ہوا رخصت جبینِ شب کی افشاں کا
نسیمِ زندگی پیغام لائی صبحِ خنداں کا

جگایا بلبلِ رنگیں نوا کو آشیانے میں
کنارے کھیت کے شانہ ہلایا اس نے دہقاں کا

طلسمِ ظلمتِ شب سورۂ والنور سے توڑا
اندھیرے میں اڑایا تاجِ زر شمعِ شبستاں کا

پڑھا خوابیدگانِ دیر پر افسونِ بیداری
برہمن کو دیا پیغام خورشیدِ درخشاں کا

ہوئی بامِ حرم پر آکے یوں گویا مؤذن سے
نہیں کھٹکا ترے دل میں نمودِ مہرِ تاباں کا؟

پکاری اس طرح دیوارِ گلشن پر کھڑے ہو کر
چٹک او غنچۂ گل! تو مؤذن ہے گلستاں کا

دیا یہ حکم صحرا میں، چلو اے قافلے والو!
چمکنے کو ہے جگنو بن کے ہر ذرہ بیاباں کا

سوئے گورِ غریباں جب گئی زندوں کی بستی سے
تو یوں بولی نظارا دیکھ کر شہرِ خموشاں کا

ابھی آرام سے لیٹے رہو میں پھر بھی آؤنگی
سلادوں گی جہاں کو، خواب سے تم کو جگاؤنگی

عشق اور موت

(ماخوذ از ٹینیسن)

سہانی نمودِ جہاں کی گھڑی تھی — تبسم فشاں زندگی کی کلی تھی
کہیں مہر کو تاجِ زر مل رہا تھا — عطا چاند کو چاندنی ہو رہی تھی
سیہ پیرہن شام کو دے رہے تھے — ستاروں کو تعلیمِ تابندگی تھی
کہیں شاخِ ہستی کو لگتے تھے پتے — کہیں زندگی کی کلی پھوٹتی تھی
فرشتے سکھاتے تھے شبنم کو رونا — ہنسی گل کو پہلے پہل آ رہی تھی
عطا درد ہوتا تھا شاعر کے دل کو — خودی تشنہ کامِ مئے بیخودی تھی
اٹھی اول اول گھٹا کالی کالی — کوئی حور چوٹی کو کھولے کھڑی تھی

زمیں کو تھا دعوٰے کہ میں آسماں ہوں

مکاں کہہ رہا تھا کہ میں لامکاں ہوں

غرض اِس قدر یہ نظارا تھا پیارا ۔۔۔ کہ نظارگی ہو سراپا نظارا

ملک آزماتے تھے پرواز اپنی ۔۔۔ جبینوں سے نورِ ازل آشکارا

فرشتہ تھا اک عشق تھا نام جس کا ۔۔۔ کہ تھی رہبری اس کی سب کا سہارا

فرشتہ کہ پتلا تھا بیتابیوں کا ۔۔۔ ملک کا ملک اور پارے کا پارا

پئے سیر فردوس کو جا رہا تھا ۔۔۔ قضا سے ملا راہ میں وہ قضا را

یہ پوچھا "ترا نام کیا، کام کیا ہے؟ ۔۔۔ نہیں آنکھ کو دید تیری گوارا"

ہوا سن کے گویا قضا کا فرشتہ ۔۔۔ اجل ہوں، مرا کام ہے آشکارا

اڑاتی ہوں میں رختِ ہستی کے پرزے ۔۔۔ بجھاتی ہوں میں زندگی کا شرارا

مری آنکھ میں جادوئے نیستی ہے ۔۔۔ پیامِ فنا ہے اسی کا اشارا

مگر ایک ہستی ہے دنیا میں ایسی ۔۔۔ وہ آتش ہے، میں سامنے اس کے پارا

شرر بن کے رہتی ہے انساں کے دل میں
وہ ہے نورِ مطلق کی آنکھوں کا تارا

ٹپکتی ہے آنکھوں سے بن بن کے آنسو
وہ آنسو کہ ہو جن کی تلخی گوارا

سنی عشق نے گفتگو جب قضا کی
ہنسی اس کے لب پر ہوئی آشکارا

گری اس تبسم کی بجلی اجل پر
اندھیرے کا ہو نور میں کیا گزارا؟

بقا کو جو دیکھا فنا ہو گئی وہ
قضا تھی، شکارِ قضا ہو گئی وہ

زہد اور رندی

اک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی
تیزی نہیں منظور طبیعت کی دکھانی

شہرہ تھا بہت آپ کی صوفی منشی کا
کرتے تھے ادب ان کا اعالی و ادانی

کہتے تھے کہ پنہاں ہے تصوف میں شریعت
جس طرح کہ الفاظ میں مضمر ہوں معانی

لبریزِ مئے زہد سے تھی دل کی صراحی
تھی تہ میں کہیں دُردِ خیالِ ہمہ دانی

کرتے تھے بیاں آپ کرامات کا اپنی
منظور تھی تعداد مریدوں کی بڑھانی

مدت سے رہا کرتے تھے ہمسائے میں میرے
تھی رند سے زاہد کی ملاقات پرانی

حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا
اقبال کہ ہے قمریِ شمشادِ معانی

پابندیِ احکامِ شریعت میں ہے کیسا؟
گو شعر میں ہے رشکِ کلیمِ ہمدانی

سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا
ہے ایسا عقیدہ اثرِ فلسفہ دانی

ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا
تفضیلِ علیؓ ہم نے سنی اس کی زبانی

سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل
مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اڑانی

کچھ عار اسے حسن فروشوں سے نہیں ہے
عادت یہ ہمارے شعرا کی ہے پرانی

گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت
اس رمز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معانی

لیکن یہ سنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے
بے داغ ہے مانندِ سحر اس کی جوانی

مجموعۂ اضداد ہے اقبال نہیں ہے
دل دفترِ حکمت ہے طبیعت خفقانی

رندی سے بھی آگاہ، شریعت سے بھی واقف
پوچھو جو تصوف کی، تو منصور کا ثانی

اس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہیں کھلتی
ہو گا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی

القصہ بہت طول دیا وعظ کو اپنے
تا دیر رہی آپ کی یہ نغز بیانی

اس شہر میں جو بات ہو اڑ جاتی ہے سب میں
میں نے بھی سنی اپنے احبا کی زبانی

اک دن جو سرِ راہ ملے حضرتِ زاہد
پھر چھڑ گئی باتوں میں وہی بات پرانی

فرمایا، شکایت وہ محبت کے سبب تھی
تھا فرض مرا راہ شریعت کی دکھانی

میں نے یہ کہا کوئی گلہ مجکو نہیں ہے
یہ آپ کا حق تھا زرہِ قربِ مکانی

خم ہے سرِ تسلیم مرا آپ کے آگے
پیری ہے تواضع کے سبب میری جوانی

گر آپ کو معلوم نہیں میری حقیقت
پیدا نہیں کچھ اس سے قصورِ ہمہ دانی

میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا
گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی

مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبالؔ کو دیکھوں
کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی

اقبالؔ بھی اقبالؔ سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے!

شاعر

قوم گویا جسم ہے، افراد ہیں اعضائے قوم
منزلِ صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم
محفلِ نظمِ حکومت، چہرۂ زیبائے قوم
شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم
مبتلائے درد کوئی عضو ہو، روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

دل

قصۂ دار و رسن بازیِ طفلانۂ دل — التجائے ارنی سرخیِ افسانۂ دل

یارب! اس ساغرِ لبریز کی مے کیا ہوگی! — جادۂ ملکِ بقا ہے خطِ پیمانۂ دل

ابرِ رحمت تھا کہ تھی عشق کی بجلی یارب! — جل گئی مزرعۂ ہستی تو اُگا دانۂ دل

حسن کا گنجِ گرانمایہ تجھے مل جاتا — تو نے فرہاد! نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل

عرش کا ہے کبھی کعبہ کا ہے دھوکا اس پر — کس کی منزل ہے الٰہی! مرا کاشانۂ دل

اس کو اپنا ہے جنوں اور مجھے سودا اپنا — دل کسی اور کا دیوانہ، میں دیوانۂ دل

تو سمجھتا نہیں اے زاہدِ ناداں! اس کو — رشکِ صد سجدہ ہے اک لغزشِ مستانۂ دل

خاک کے ڈھیر کو اکسیر بنا دیتی ہے — وہ اثر رکھتی ہے خاکسترِ پروانۂ دل

عشق کے دام میں پھنس کر یہ رِہا ہوتا ہے
برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

موجِ دریا

مضطرب رکھتا ہے میرا دلِ بیتاب مجھے
عین ہستی ہے تڑپ صورتِ سیماب مجھے

موج ہے نام مرا، بحر ہے پایاب مجھے
ہو نہ زنجیر کبھی حلقۂ گرداب مجھے

آب میں مثلِ ہوا جاتا ہے توسن میرا
خارِ ماہی سے نہ اٹکا کبھی دامن میرا

میں اچھلتی ہوں کبھی جذبِ مہِ کامل سے
جوش میں سر کو پٹکتی ہوں کبھی ساحل سے

ہوں وہ رہرو کہ محبت ہے مجھے منزل سے
کیوں تڑپتی ہوں، یہ پوچھے کوئی میرے دل سے

زحمتِ تنگیٔ دریا سے گریزاں ہوں میں
وسعتِ بحر کی فرقت میں پریشاں ہوں میں

رخصت اے بزمِ جہاں!

(ماخوذ از ایمرسن)

رخصت اے بزمِ جہاں! سوئے وطن جاتا ہوں میں
آہ! اس آباد ویرانے میں گھبراتا ہوں میں

بسکہ میں افسردہ دل ہوں درخورِ محفل نہیں
تو مرے قابل نہیں ہے، میں ترے قابل نہیں

قید ہے دربارِ سلطان و شبستانِ وزیر
توڑ کر نکلے گا زنجیرِ طلائی کا اسیر

گو بڑی لذت تری ہنگامہ آرائی میں ہے
اجنبیت سی مگر تیری شناسائی میں ہے

مدتوں تیرے خود آراؤں سے ہم صحبت رہا

مدتوں بے تاب موجِ بحر کی صورت رہا

مدتوں بیٹھا ترے ہنگامۂ عشرت میں میں

روشنی کی جستجو کرتا رہا ظلمت میں میں

مدتوں ڈھونڈا کیا نظّارۂ گل خار میں

آہ! وہ یوسف نہ ہاتھ آیا ترے بازار میں

چشمِ حیراں ڈھونڈتی اب اور نظّارے کو ہے

آرزو ساحل کی مجھ طوفان کے مارے کو ہے

چھوڑ کر مانندِ بو، تیرا چمن جاتا ہوں میں

رخصت اے بزمِ جہاں سوئے وطن جاتا ہوں میں

گھر بنایا ہے سکوتِ دامنِ کہسار میں

آہ! یہ لذت کہاں موسیقیِ گفتار میں!

ہمنشینِ نرگسِ شہلا، رفیقِ گل ہوں میں
ہے چمن میرا وطن، ہمسایۂ بلبل ہوں میں
شام کو آوازِ چشموں کی سلاتی ہے مجھے
صبح فرشِ سبز سے کوئل جگاتی ہے مجھے
بزمِ ہستی میں ہے سب کو محفل آرائی پسند
ہے دلِ شاعر کو لیکن کنجِ تنہائی پسند
ہے جنوں مجکو کہ گھبراتا ہوں آبادی میں میں
ڈھونڈتا پھرتا ہوں کس کو کوہ کی وادی میں میں؟
شوق کس کا سبزہ زاروں میں پھراتا ہے مجھے؟
اور چشموں کے کناروں پر سلاتا ہے مجھے؟
طعنہ زن ہے تو کہ شیدا کنجِ عزلت کا ہوں میں
دیکھ اے غافل! پیامی بزمِ قدرت کا ہوں میں

ہموطن شمشاد کا، قمری کا میں ہمراز ہوں!

اس چمن کی خامشی میں گوشِ برآواز ہوں!

کچھ جو سنتا ہوں تو اوروں کو سنانے کے لئے

دیکھتا ہوں کچھ تو اوروں کو دکھانے کے لئے

عاشقِ عزلت ہے دل، نازاں ہوں اپنے گھر پہ میں

خندہ زن ہوں مسندِ دارا و اسکندر پہ میں

لیٹنا زیرِ شجر رکھتا ہے جادو کا اثر

شام کے تارے پہ جب پڑتی ہو رہ رہ کر نظر

علم کے حیرت کدے میں ہے کہاں اس کی نمود!

گل کی پتی میں نظر آتا ہے رازِ ہست و بود!

طفلِ شیرخوار

میں نے چاقو تجھ سے چھینا ہے تو چلّاتا ہے تو

مہرباں ہوں میں، مجھے نامہرباں سمجھا ہے تو؟

پھر پڑا روئے گا اے نو واردِ اقلیمِ غم

چبھ نہ جائے دیکھنا! باریک ہے نوکِ قلم

آہ! کیوں دکھ دینے والی شے سے تجھ کو پیار ہے

کھیل اس کاغذ کے ٹکڑے سے یہ بے آزار ہے

گیند ہے تیری کہاں؟ چینی کی بلّی ہے کدھر؟

وہ ذرا سا جانور، ٹوٹا ہوا ہے جس کا سر

تیرا آئینہ تھا آزادِ غبارِ آرزو

آنکھ کھلتے ہی چمک اٹھا شرارِ آرزو

ہاتھ کی جنبش میں، طرزِ دید میں پوشیدہ ہے

تیری صورت آرزو بھی تیری نوزائیدہ ہے

زندگانی ہے تری آزادِ قیدِ امتیاز

تیری آنکھوں پر ہویدا ہے مگر قدرت کا راز

جب کسی شے پر بگڑ کر مجھ سے چلاتا ہے تو

کیا تماشا ہے ردی کاغذ سے من جاتا ہے تو

آہ! اس عادت میں ہم آہنگ ہوں میں بھی ترا

تو تلون آشنا، میں بھی تلون آشنا

عارضی لذت کا شیدائی ہوں، چلاتا ہوں میں

جلد آجاتا ہے غصہ، جلد من جاتا ہوں میں

میری آنکھوں کو لبھا لیتا ہے حسنِ ظاہری

کم نہیں کچھ تیری نادانی سے نادانی مری

تیری صورت گاہ گریاں گاہ خنداں میں بھی ہوں
دیکھنے کو نوجواں ہوں، طفلِ ناداں میں بھی ہوں

تصویرِ درد

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری
یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں؟
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری
اُٹھائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری
اڑا لی قمریوں نے، طوطیوں نے، عندلیبوں نے
چمن والوں نے مِل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

ٹپک اے شمع! آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے

سراپا درد ہوں، حسرت بھری ہے داستاں میری

الٰہی! پھر مزا کیا ہے یہاں دنیا میں رہنے کا؟

حیاتِ جاوداں میری، نہ مرگِ ناگہاں میری

مرا رونا نہیں، رونا ہے یہ سارے گلستاں کا

وہ گل ہوں میں، خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری

"دریں حسرت سرا عمریست افسونِ جرس دارم

زفیضِ دل طپیدن ہا خروشِ بے نفس دارم"

ریاضِ دہر میں نا آشنائے بزمِ عشرت ہوں

خوشی روتی ہے جس کو، میں وہ محرومِ مسرت ہوں

مری بگڑی ہوئی تقدیر کو روتی ہے گویائی

میں حرفِ زیرِ لب شرمندۂ گوشِ سماعت ہوں

پریشاں ہوں میں مشتِ خاک، لیکن کچھ نہیں کھلتا
سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گردِ کدورت ہوں
یہ سب کچھ ہے مگر ہستی مری مقصد ہے قدرت کا
سراپا نور ہو جس کی حقیقت، میں وہ ظلمت ہوں
خزینہ ہوں، چھپایا مجھ کو مشتِ خاکِ صحرا نے
کسی کو کیا خبر ہے میں کہاں ہوں کس کی دولت ہوں؟
نظر میری نہیں ممنونِ سیرِ عرصۂ ہستی
میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں
نہ صہبا ہوں، نہ ساقی ہوں، نہ مستی ہوں، نہ پیمانہ
میں اس میخانۂ ہستی میں ہر شے کی حقیقت ہوں
مجھے رازِ دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

عطا ایسا بیاں مجھ کو ہوا رنگیں بیانوں میں
کہ بامِ عرش کے طائر ہیں میرے ہمزبانوں میں

اثر یہ بھی ہے اک میرے جنونِ فتنہ ساماں کا
مرا آئینۂ دل ہے قضا کے رازدانوں میں

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں! مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں

نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں!
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

سُن اے غافل صدا میری! یہ ایسی چیز ہے جس کو
وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں؟
یہ خاموشی کہاں تک؟ لذتِ فریاد پیدا کر!
زمیں پر تو ہو، اور تیری صدا ہو آسمانوں میں!
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں
یہی آئینِ قدرت ہے، یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن، محبوبِ فطرت ہے

ہویدا آج اپنے زخمِ پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا

جلانا ہے مجھے ہر شمعِ دل کو سوزِ پنہاں سے
تری ظلمت میں میں روشن چراغاں کر کے چھوڑوں گا

مگر غنچوں کی صورت ہوں دلِ درد آشنا پیدا
چمن میں مشتِ خاک اپنی پریشاں کر کے چھوڑوں گا

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے، تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

مجھے اے ہمنشیں! رہنے دے شغلِ سینہ کاوی میں
کہ میں داغِ محبت کو نمایاں کر کے چھوڑوں گا

دکھا دوں گا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے
تجھے بھی صورتِ آئینہ حیراں کر کے چھوڑوں گا

جو ہے پردوں میں پنہاں چشمِ بینا دیکھ لیتی ہے
زمانے کی طبیعت کا تقاضا دیکھ لیتی ہے

کیا رفعت کی لذت سے نہ دل کو آشنا تو نے
گذاری عمر پستی میں مثالِ نقشِ پا تو نے

رہا دل بستۂ محفل مگر اپنی نگاہوں کو
کیا بیرونِ محفل سے نہ حیرت آشنا تو نے

فدا کرتا رہا دل کو حسینوں کی اداؤں پر
مگر دیکھی نہ اس آئینے میں اپنی ادا تو نے

تعصب چھوڑ ناداں! دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے

سراپا نالۂ بیدادِ سوزِ زندگی ہو جا!
سپند آسا گرہ میں باندھ رکھی ہے صدا تو نے

صفائے دل کو کیا آرائشِ رنگِ تعلق سے

کفِ آئینہ پر باندھی ہے او ناداں! حنا تو نے

زمیں کیا آسماں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے

غضب ہے سطرِ قرآں کو چلیپا کر دیا تو نے!

زباں سے گر کیا توحید کا دعوےٰ تو کیا حاصل!

بنایا ہے بتِ پندار کو اپنا خدا تو نے

کنوئیں میں تو نے یوسف کو جو دیکھا بھی تو کیا دیکھا

ارے غافل! جو مطلق تھا، مقیّد کر دیا تو نے

ہوس بالائے منبر ہے تجھے رنگیں بیانی کی

نصیحت بھی تری صورت ہے اک افسانہ خوانی کی

دکھا وہ حسنِ عالم سوز اپنی چشمِ پر نم کو

جو تڑپاتا ہے پروانے کو، رلواتا ہے شبنم کو

نرا نظارہ ہی اے بوالہوس! مقصد نہیں اس کا
بنایا ہے کسی نے کچھ سمجھ کر چشمِ آدم کو
اگر دیکھا بھی اس نے سارے عالم کو تو کیا دیکھا
نظر آئی نہ کچھ اپنی حقیقت جام سے جم کو
شجر ہے فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو
نہ اُٹھا جذبۂ خورشید سے اک برگِ گل تک بھی
یہ رفعت کی تمنا ہے کہ لے اڑتی ہے شبنم کو
پھرا کرتے نہیں مجروحِ الفت فکرِ درماں میں
یہ زخمی آپ کر لیتے ہیں پیدا اپنی مرہم کو
محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے
ذرا سے بیج سے پیدا ریاضِ طور ہوتا ہے

دوا ہر دکھ کی ہے مجروحِ تیغِ آرزو رہنا
علاجِ زخم ہے آزادِ احسانِ رفو رہنا

شرابِ بیخودی سے تا فلک پرواز ہے میری
شکستِ رنگ سے سیکھا ہے میں نے بن کے بو رہنا

تھمے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں
عبادت چشمِ شاعر کی ہے ہر دم باوضو رہنا

بنائیں کیا سمجھ کر شاخِ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ! کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیرِ امتیازِ ما و تو رہنا

یہ استغنا ہے پانی میں نگوں رکھتا ہے ساغر کو
تجھے بھی چاہیے مثلِ حبابِ آبجو رہنا

نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو! رہنا

شرابِ روح پرور ہے محبت نوعِ انساں کی
سکھایا اس نے مجکو مست بے جام وسبو رہنا

محبت ہی سے پائی ہے شفا. بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

بیابانِ محبت دشتِ غربت بھی، وطن بھی ہے
یہ ویرانہ قفس بھی، آشیانہ بھی، چمن بھی ہے

محبت ہی وہ منزل ہے کہ منزل بھی ہے صحرا بھی
جرس بھی، کارواں بھی، راہبر بھی، راہزن بھی ہے

مرض کہتے ہیں سب اس کو، یہ ہے لیکن مرض ایسا
چھپا جس میں علاجِ گردشِ چرخِ کہن بھی ہے

جلانا دل کا ہے گویا سراپا نور ہو جانا

یہ پروانہ جو سوزاں ہو تو شمعِ انجمن بھی ہے

وہی اک حسن ہے، لیکن نظر آتا ہے ہر شے میں

یہ شیریں بھی ہے گویا، بیستوں بھی، کوہکن بھی ہے

اجاڑا ہے تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں کو

مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے؟

سکوت آموز طولِ داستانِ درد ہے، ورنہ

زباں بھی ہے ہمارے منہ میں اور تابِ سخن بھی ہے

"نمیگردید کوتہ رشتۂ معنی، رہا کردم

حکایت بود بے پایاں، بخاموشی ادا کردم"

نالۂ فراق

(آرنلڈ کی یاد میں)

جا بسا مغرب میں آخر اے مکاں تیرا مکیں
آہ! مشرق کی پسند آئی نہ اس کو سرزمیں

آ گیا آج اس صداقت کا مرے دل کو یقیں
ظلمتِ شب سے ضیائے روزِ فرقت کم نہیں

"تا ز آغوشِ وداعش داغِ حیرت چیدہ است
ہمچو شمعِ کشتہ در چشمم نگہ خوابیدہ است"

کشتۂ عزلت ہوں، آبادی میں گھبراتا ہوں میں
شہر سے سودا کی شدت میں نکل جاتا ہوں میں

یادِ ایامِ سلف سے دل کو تڑپاتا ہوں میں
بہرِ تسکیں تیری جانب دوڑتا آتا ہوں میں

آنکھ گو مانوس ہے تیرے در و دیوار سے
اجنبیت ہے مگر پیدا مری رفتار سے

ذرہ میرے دل کا خورشید آشنا ہونے کو تھا
آئینہ ٹوٹا ہوا عالم نما ہونے کو تھا

نخل میری آرزوؤں کا ہرا ہونے کو تھا
آہ! کیا جانے کوئی میں کیا سے کیا ہونے کو تھا!

ابرِ رحمت دامن از گلزارِ من برچید و رفت
اندکے بر غنچہ ہائے آرزو بارید و رفت

تو کہاں ہے اے کلیمِ ذروۂ سینائے علم!
تھی تری موجِ نفس بادِ نشاط افزائے علم

اب کہاں وہ شوقِ رہ پیمائیِ صحرائے علم!
تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم

"شورِ لیلیٰ کو؟ کہ باز آرائشِ سودا کند
خاکِ مجنوں را غبارِ خاطرِ صحرا کند"

کھول دیگا دستِ وحشت عقدۂ تقدیر کو
توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو

دیکھتا ہے دیدۂ حیراں تری تصویر کو
کیا تسلی ہو مگر گردیدۂ تقدیر کو؟

"تابِ گویائی نہیں رکھتا دہن تصویر کا
خامشی کہتے ہیں جس کو ہے سخن تصویر کا"

چاند

میرے ویرانے سے کوسوں دور ہے تیرا وطن
ہے مگر دریائے دل تیری کشش سے موجزن

قصد کس محفل کا ہے؟ آتا ہے کس محفل سے تو؟
زرد رو شاید ہوا رنجِ رہِ منزل سے تو؟

آفرینش میں سراپا نور تو، ظلمت ہوں میں
اس سیہ روزی پہ لیکن تیرا ہم قسمت ہوں میں

آہ! میں جلتا ہوں سوزِ اشتیاقِ دید سے
تو سراپا سوز داغِ منتِ خورشید سے

ایک حلقے پر اگر قائم تری رفتار ہے
میری گردش بھی مثالِ گردشِ پرکار ہے

زندگی کی رہ میں سرگرداں ہے تو، حیراں ہوں میں

تو فروزاں محفلِ ہستی میں ہے، سوزاں ہوں میں

میں رہِ منزل میں ہوں، تو بھی رہِ منزل میں ہے

تیری محفل میں جو خاموشی ہے، میرے دل میں ہے

تو طلب خو ہے، تو میرا بھی یہی دستور ہے

چاندنی ہے نور تیرا، عشق میرا نور ہے

انجمن ہے ایک میری بھی جہاں رہتا ہوں میں

بزم میں اپنی اگر یکتا ہے تو، تنہا ہوں میں

مہر کا پرتو ترے حق میں ہے پیغامِ اجل

محو کر دیتا ہے مجکو جلوۂ حسنِ ازل

پھر بھی اے ماہِ مبیں! میں اور ہوں تو اور ہے

درد جس پہلو میں اٹھتا ہو وہ پہلو اور ہے!

گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں، سراپا نور تو
سینکڑوں منزل ہے ذوقِ آگہی سے دور تو
جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے
یہ چمک وہ ہے جبیں جس سے تری محروم ہے!

بلالؓ

چمک اٹھا جو ستارہ ترے مقدر کا
حبش سے تجھ کو اٹھا کر حجاز میں لایا
ہوئی اسی سے ترے غمکدے کی آبادی
تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی
وہ آستاں نہ چھٹا تجھ سے ایک دم کیلئے
کسی کے شوق میں تو نے مزے ستم کیلئے

جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں
ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں

نظر تھی صورتِ سلماں ادا شناس تری
شرابِ دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری

تجھے نظارے کا مثلِ کلیم سودا تھا　　اویس طاقتِ دیدار کو ترستا تھا

مدینہ تیری نگاہوں کا نور تھا گویا　　ترے لئے تو یہ صحرا ہی طور تھا گویا

تری نظر کو رہی دید میں بھی حسرتِ دید　　خنک دلے کہ تپید و دمے نیاسائید

گری وہ برق تری جانِ ناشکیبا پر　　کہ خندہ زن تری ظلمت تھی دستِ موسیٰ پر

تپش ز شعلہ گرفتند و بر دلِ تو زدند
چہ برقِ جلوہ بخاشاکِ حاصلِ تو زدند!

ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری　　کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری

اذاں ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی　　نماز اس کے نظارے کا اک بہانہ بنی

خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا!
خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اس کا!

سرگزشتِ آدم

سنے کوئی مری غربت کی داستاں مجھ سے
بھلایا قصۂ پیمانِ اوّلیں میں نے

لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنت میں
پیا شعور کا جب جامِ آتشیں میں نے

رہی حقیقتِ عالم کی جستجو مجھ کو
دکھایا اوجِ خیالِ فلک نشیں میں نے

ملا مزاج تغیّر پسند کچھ ایسا
کیا قرار نہ زیرِ فلک کہیں میں نے

نکالا کعبے سے پتھر کی مورتوں کو کبھی
کبھی بتوں کو بنایا حرم نشیں میں نے

کبھی میں ذوقِ تکلم میں طور پر پہنچا
چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں میں نے

کبھی صلیب پہ اپنوں نے مجھ کو لٹکایا
کیا فلک کو سفر چھوڑ کر زمیں میں نے

کبھی میں غارِ حرا میں چھپا رہا برسوں
دیا جہاں کو کبھی جامِ آخریں میں نے

سنایا ہند میں آ کر سرودِ ربّانی
پسند کی کبھی یوناں کی سرزمیں میں نے

دیارِ ہند نے جس دم مری صدا نہ سنی
بسایا خطۂ جاپان و ملکِ چیں میں نے

بنایا ذرّوں کی ترکیب سے کبھی عالم — خلافِ معنیٔ تعلیمِ اہلِ دیں میں نے

لہو سے لال کیا سینکڑوں زمینوں کو — جہاں میں چھیڑ کے پیکارِ عقل و دیں میں نے

سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی — اسی خیال میں راتیں گزار دیں میں نے

ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں — سکھایا مسئلۂ گردشِ زمیں میں نے

کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر — لگا کے آئنۂ عقلِ دوربیں میں نے

کیا اسیر شعاعوں کو، برقِ مضطر کو — بنا دی غیرتِ جنت یہ سرزمیں میں نے

مگر خبر نہ ملی آہ! رازِ ہستی کی — کیا خرد سے جہاں کو تہِ نگیں میں نے

ہوئی جو چشمِ مظاہر پرست وا آخر
تو پایا خانۂ دل میں اسے مکیں میں نے

ترانۂ ہندی

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

غربت میں ہوں اگر ہم، رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

پربت وہ سب سے اونچا، ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا، وہ پاسباں ہمارا

گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا

اے آبِ رودِ گنگا! وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

اقبال! کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

جگنو

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں؟
آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں؟
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا؟
غربت میں آ کے چمکا، گمنام تھا وطن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا؟
ذرّہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں؟
حسنِ قدیم کی یہ پوشیدہ اک جھلک تھی؟
لے آئی جس کو قدرت خلوت سے انجمن میں
چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی، روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے، آیا کبھی گہن میں

پروانہ اک پتنگا، جگنو بھی اک پتنگا
وہ روشنی کا طالب، یہ روشنی سراپا

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی
پروانہ کو تپش دی، جگنو کو روشنی دی
رنگیں نوا بنایا مرغانِ بے زباں کو
گل کو زبان دے کر تعلیمِ خامشی دی

نظارۂ شفق کی خوبی زوال میں تھی چمکا کے اس پری کو تھوڑی سی زندگی دی
رنگیں کیا سحر کو، بانکی دلہن کی صورت پہنا کے لال جوڑا شبنم کی آرسی دی
سایہ دیا شجر کو، پرواز دی ہوا کو پانی کو دی روانی، موجوں کو بے کلی دی

یہ امتیاز لیکن اک بات ہے ہماری
جگنو کا دن وہی ہے جو رات ہے ہماری

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے انساں میں وہ سخن ہے، غنچے میں وہ چٹک ہے
یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا واں چاندنی ہے جو کچھ، یاں درد کی کسک ہے
اندازِ گفتگو نے دھوکے دیئے ہیں ورنہ نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی جگنو میں جو چمک ہے، وہ پھول میں مہک ہے

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو؟
ہر شے میں جبکہ پنہاں خاموشیِ ازل ہو

صبح کا ستارہ

لطفِ ہمسائگیِ شمس و قمر کو چھوڑوں
اور اس خدمتِ پیغامِ سحر کو چھوڑوں

میرے حق میں تو نہیں تاروں کی بستی اچھی
اس بلندی سے زمیں والوں کی پستی اچھی

آسماں کیا، عدم آباد وطن ہے میرا
صبح کا دامنِ صد چاک کفن ہے میرا

میری قسمت میں ہے ہر روز کا مرنا جینا
ساقیِ موت کے ہاتھوں سی صبوحی پینا

نہ یہ خدمت، نہ یہ عزت، نہ یہ رفعت اچھی
اس گھڑی بھر کے چمکنے سے تو ظلمت اچھی

میری قدرت میں جو ہوتا، تو نہ اختر بنتا
قعرِ دریا میں چمکتا ہوا گوہر بنتا

واں بھی موجوں کی کشاکش سی جو دل گھبراتا
چھوڑ کر بحر، کہیں زیبِ گلو ہو جاتا

ہے چمکنے میں مزا حسن کا زیور بن کر
زینتِ تاجِ سرِ بانوئے قیصر بن کر

ایک پتھر کے جو ٹکڑے کا نصیبا جاگا
خاتمِ دستِ سلیماں کا نگیں بن کے رہا

ایسی چیزوں کا مگر دہر میں ہے کام شکست — ہے گہرہائے گرانمایہ کا انجام شکست

زندگی وہ ہے کہ جو ہو نہ شناسائے اجل — کیا وہ جینا ہے کہ ہو جس میں تقاضائے اجل

ہے یہ انجام اگر زینتِ عالم ہو کر
کیوں نہ گر جاؤں کسی پھول پہ شبنم ہو کر؟

کسی پیشانی کے افشاں کے ستاروں میں رہوں — کسی مظلوم کی آہوں کے شراروں میں رہوں

اشک بن کر سرِ مژگاں سے اٹک جاؤں میں — کیوں نہ اس بیوی کی آنکھوں سے ٹپک جاؤں میں؟

ق

جس کا شوہر ہو رواں، ہو کے زرہ میں مستور — سوئے میدانِ وغا، حبِ وطن سے مجبور

یاس و امید کا نظارہ جو دکھلاتی ہو — جس کی خاموشی سے تقریر بھی شرماتی ہو

جس کو شوہر کی رضا تابِ شکیبائی دے — اور نگاہوں کو حیا طاقتِ گویائی دے

زرد رخصت کی گھڑی عارضِ گلگوں ہو جائے — کششِ حسن غمِ ہجر سے افزوں ہو جائے

لاکھ وہ ضبط کرے پر میں ٹپک ہی جاؤں — ساغرِ دیدۂ پرنم سے چھلک ہی جاؤں

خاک میں مل کے حیاتِ ابدی پا جاؤں — عشق کا سوز زمانے کو دکھاتا جاؤں

ہندوستانی بچّوں کا قومی گیت

چشتیؒ نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے پھر تاب دیکے جس نے چمکائے کہکشاں سے
وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے میرِ عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

بندے کلیم جس کے، پربت جہاں کے سینا نوحِ نبی کا آکر ٹھیرا جہاں سفینا

رفعت ہے جس زمیں کی بامِ فلک کا زینا
جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

نیا شوالہ

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

آ، غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ، اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں

ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلادیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

داغ

عظمتِ غالب ہے اک مدت سے پیوندِ زمیں
مہدیِ مجروح ہے شہرِ خموشاں کا مکیں

توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیر
چشمِ محفل میں ہے اب تک کیفِ صہبائے امیر

آج لیکن ہمنوا! سارا چمن ماتم میں ہے!
شمعِ روشن بجھ گئی، بزمِ سخن ماتم میں ہے!

بلبلِ دلی نے باندھا اس چمن میں آشیاں
ہمنوا ہیں سب عنادل باغِ ہستی کے جہاں

چل بسا داغ آہ! میت اسکی زیبِ دوش ہے!
آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے!

اب کہاں وہ بانکپن! وہ شوخیِ طرزِ بیاں!
آگ تھی کافورِ پیری میں جوانی کی نہاں

تھی زبانِ داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے
یعنی یہ لیلیٰ وہاں بے پردہ، یاں محمل میں ہے

اب صبا سے کون پوچھے گا سکوتِ گل کا راز؟
کون سمجھے گا چمن میں نالۂ بلبل کا راز؟

تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں
آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

اور دکھلائیں گے مضموں کی ہمیں باریکیاں
اپنے فکرِ نکتہ آرا کی فلک پیمائیاں

تلخیِ دوراں کے نقشے کھینچ کر رلوائیں گے
یا تخیل کی نئی دنیا ہمیں دکھلائیں گے

اس چمن میں ہونگے پیدا بلبلِ شیراز بھی
سینکڑوں ساحر بھی ہونگے، صاحبِ اعجاز بھی

اٹھیں گے آذر ہزاروں شعر کے بتخانے سے
مے پلائیں گے نئے ساقی نئے پیمانے سے

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت
ہوں گی اے خوابِ جوانی! تیری تعبیریں بہت

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون؟
اٹھ گیا ناوک فگن، مارے گا دل پہ تیر کون؟

اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہوں میں
تو بھی رو اے خاکِ دلی! داغ کو روتا ہوں میں

آہ اے بیت الحرام مذہبِ اہلِ سخن! / ہو گیا پھر آج پامالِ خزاں تیرا چمن!

وہ گلِ رنگیں ترا رخصت مثالِ بو ہوا / یعنی خالی داغ سے کاشانۂ اردو ہوا

تھی نہ شاید کچھ کشش ایسی وطن کی خاک میں / وہ مہِ کامل ہوا پنہاں دکن کی خاک میں

اٹھ گئے ساقی جو تھے میخانہ خالی رہ گیا / یادگارِ بزمِ دہلی ایک حالی رہ گیا!

آرزو کو خون رلواتی ہے بیدادِ اجل / مارتا ہے تیر تاریکی میں صیادِ اجل

کھل نہیں سکتی شکایت کیلئے لیکن زباں / ہے خزاں کا رنگ بھی وجہِ قیامِ گلستاں

ایک ہی قانونِ عالمگیر کے ہیں سب اثر
بوئے گل کا باغ سے، گلچیں کا دنیا سے سفر

ابر

اٹھی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا
سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سربن کا

نہاں ہوا جو رخِ مہر زیرِ دامنِ ابر
ہوائے سرد بھی آئی سوارِ توسنِ ابر

گرج کا شور نہیں ہے، خموش ہے یہ گھٹا
عجیب میکدۂ بےخروش ہے یہ گھٹا

چمن میں حکمِ نشاطِ مدام لائی ہے
قبائے گل میں گہر ٹانکنے کو آئی ہے

جو پھول مہر کی گرمی سے سو چلے تھے، اٹھے
زمیں کی گود میں جو پڑ کے سو رہے تھے، اٹھے

ہوا کے زور سے ابھرا، بڑھا، اڑا بادل
اٹھی وہ اور گھٹا، لو! برس پڑا بادل

عجیب خیمہ ہے کہسار کے نہالوں کا
یہیں قیام ہو وادی میں پھرنے والوں کا

ایک پرندہ اور جگنو

سرِ شام ایک مرغِ نغمہ پیرا
کسی ٹہنی پہ بیٹھا گا رہا تھا

چمکتی چیز اک دیکھی زمیں پر
اڑا طائر اسے جگنو سمجھ کر

کہا جگنو نے او مرغِ نوا ریز
نہ کر بیکس پہ منقارِ ہوس تیز

تجھے جس نے چہک، گل کو مہک دی
اسی اللہ نے مجھ کو چمک دی

لباسِ نور میں مستور ہوں میں
پتنگوں کے جہاں کا طور ہوں میں

چہک تیری بہشتِ گوش اگر ہے
چمک میری بھی فردوسِ نظر ہے

پروں کو میرے قدرت نے ضیا دی
تجھے اس نے صدائے دلربا دی

تری منقار کو گانا سکھایا
مجھے گلزار کی مشعل بنایا

چمک بخشی مجھے، آواز تجھ کو
دیا ہے سوز مجھ کو، ساز تجھ کو

مخالف ساز کا ہوتا نہیں سوز
جہاں میں ساز کا ہے ہم نشیں سوز

قیامِ بزمِ ہستی ہے انہیں سے — ظہورِ اوج و پستی ہے انہیں سے

ہم آہنگی سے ہے محفل جہاں کی
اسی سے ہے بہار اس بوستاں کی

بچّہ اور شمع

کیسی حیرانی ہے یہ اے طفلکِ پروانہ خو! — شمع کے شعلوں کو گھڑیوں دیکھتا رہتا ہے تو

یہ مری آغوش میں بیٹھے ہوئے جنبش ہے کیا! — روشنی سے کیا بغل گیری ہے تیرا مدعا؟

اس نظارے سے ترا ننھا سا دل حیران ہے
یہ کسی دیکھی ہوئی شے کی مگر پہچان ہے!

شمع اک شعلہ ہے، لیکن تو سراپا نور ہے — آہ! اس محفل میں یہ عریاں ہے، تو مستور ہے

دستِ قدرت نے اسے کیا جانے کیوں عریاں کیا! — تجھ کو خاکِ تیرہ کے فانوس میں پنہاں کیا

نور تیرا چھپ گیا زیرِ نقابِ آگہی! — ہے غبارِ دیدۂ بینا حجابِ آگہی!

زندگانی جس کو کہتے ہیں فراموشی ہے یہ

خواب ہے، غفلت ہے، سرمستی ہے، بیہوشی ہے یہ

محفلِ قدرت ہے، اک دریائے بے پایانِ حسن
آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفانِ حسن

حسن کوہستاں کی ہیبت ناک خاموشی میں ہے
مہر کی ضوگستری، شب کی سیہ پوشی میں ہے

آسمانِ صبح کی آئینہ پوشی میں ہے یہ
شام کی ظلمت، شفق کی گل فروشی میں ہے یہ

عظمتِ دیرینہ کے مٹتے ہوئے آثار میں
طفلکِ ناآشنا کی کوششِ گفتار میں

ساکنانِ صحنِ گلشن کی ہم آوازی میں ہے
ننھے ننھے طائروں کی آشیاں سازی میں ہے

چشمۂ کہسار میں، دریا کی آزادی میں حسن
شہر میں، صحرا میں، ویرانے میں، آبادی میں حسن

روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس
ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثلِ جرس

حسن کے اس عام جلوے میں بھی یہ بیتاب ہے

زندگی اس کی مثالِ ماہیِ بے آب ہے

کنارِ راوی

سکوتِ شام میں محوِ سرود ہے راوی	نہ پوچھ مجھ سے جو ہے کیفیت مرے دل کی
پیام سجدہ کا یہ زیر و بم ہوا مجھ کو	جہاں تمام سوادِ حرم ہوا مجھ کو

سرِ کنارۂ آبِ رواں کھڑا ہوں میں
خبر نہیں مجھے لیکن کہاں کھڑا ہوں میں

شرابِ سرخ سے رنگیں ہوا ہے دامنِ شام	لئے ہے پیرِ فلک دستِ رعشہ دار میں جام
عدم کو قافلۂ روز تیز گام چلا	شفق نہیں ہے، یہ سورج کے پھول ہیں گویا!
کھڑے ہیں دور وہ عظمت فزائے تنہائی	منارِ خواب گہِ شہسوارِ چغتائی
فسانۂ ستمِ انقلاب ہے یہ محل	کوئی زمانِ سلف کی کتاب ہے یہ محل

مقام کیا ہے، سرودِ خموش ہے گویا
شجر؟ یہ انجمنِ بے خروش ہے گویا!

رواں ہے سینۂ دریا پہ اک سفینۂ تیز
ہوا ہے موج سے ملّاح جس کا گرمِ ستیز

سبک روی میں ہے مثلِ نگاہ یہ کشتی
نکل کے حلقۂ حدِ نظر سے دور گئی

جہازِ زندگیِ آدمی رواں ہے یونہیں
ابد کے بحر میں پیدا یونہیں، نہاں ہے یونہیں

شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے، لیکن فنا نہیں ہوتا!

التجائے مسافر

(بہ درگاہِ حضرت محبوبِ الٰہیؒ، دہلی)

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری، فیض عام ہے تیرا

ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم
نظامِ مہر کی صورت نظام ہے تیرا

تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

نہاں ہے تیری محبت میں رنگِ محبوبی
بڑی ہے شان، بڑا احترام ہے تیرا

اگر سیاہ دلم، داغِ لالہ زارِ توام
وگر کشادہ جبینم، گُلِ بہارِ توام

چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثلِ نکہتِ گل
ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجکو

چلی ہے لیکے وطن کے نگار خانے سے
شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجکو

نظر ہے ابرِ کرم پر، درختِ صحرا ہوں
کیا خدا نے نہ محتاجِ باغباں مجکو

فلک نشیں صفتِ مہر ہوں زمانے میں
تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجکو

مقام ہمسفروں سے ہو اس قدر آگے
کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجکو

مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دکھے
کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجکو

دلوں کو چاک کرے مثلِ شانہ جس کا اثر
تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجکو

بنایا تھا جسے چن چن کے خار و خس میں نے
چمن میں پھر نظر آئے وہ آشیاں مجکو

پھر آ رکھوں قدمِ مادر و پدر پہ جبیں
کیا جنھوں نے محبت کا راز داں مجکو

وہ شمعِ بارگہِ خاندانِ مرتضوی
رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجکو

نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی [احسن] بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجکو

دعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان و زمیں کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجکو

وہ میرا یوسفِ ثانی، وہ شمعِ محفلِ عشق ہوئی ہے جس کی اخوت قرارِ جاں مجکو

جلا کے جس کی محبت نے دفترِ من و تو ہوائے عیش میں پالا، کیا جواں مجکو

ریاضِ دہر میں مانندِ گل رہے خنداں کہ ہے عزیز تر از جاں وہ جانِ جاں مجکو

شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے!

یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے!